دستِ حنائی
منظور پروانہ

دستِ حنائی

منظور پروانہ

یہ

کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش

کے مالی تعاون سے شائع

ہوئی

نام کتاب	═══	دستِ حنائی
موضوع	═══	افسانہ
مصنف وناشر	═══	منظور پروانہ
سنِ اشاعت	═══	۲۰۱۲ء
تعداد اشاعت	═══	۴۰۰ر کتب
کمپوزنگ	═══	منیر احمد
قیمت	═══	125/- روپے

طباعت: نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج، لکھنؤ۔
موبائل: 9935114393

ملنے کے پتے:

۱۔ دانش محل۔امین آباد لکھنؤ

۲۔ چکن شاپ، نظیر آباد لکھنؤ

۳۔ ماہنامہ ''لاریب''۔امین آباد لکھنؤ
فون رابطہ: 9452482159
9307359793

انتساب

اپنی اس اولین نثری تحقیقی
کاوش
کو والد محترم
الحاج مقبول احمد (مرحوم ومغفور)
(اور)
تمام استادان گرامی
کے نام
جنھوں نے ادب سے روشناس کرایا
اور
قدم قدم پر راہ نمائی فرمائی

تعارف

نام : منظور احمد صدیقی

قلمی نام : منظور پروانہ

والد کا نام : الحاج مقبول احمد مرحوم

تاریخ ولادت : ۲۰/جون ۱۹۴۸ء

جائے ولادت : لکھنؤ

تعلیم : ایم۔اے (پالیٹکس) لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ ۱۹۷۰ء

ملازمت : ۸/اگست ۱۹۷۲ء کو محکمہ آبپاشی میں جونیر کلرک کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا کی اور ۳۰/جون ۲۰۰۸ء کو بحیثیت سینئر اسسٹنٹ سبکدوش ہوا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ میں بھی جون ۱۹۷۲ سے ۷/اگست ۱۹۷۲ء یعنی کل دو ماہ کام کیا۔

مشاغل : مطالعہ کرنا۔ نثر اور نظم لکھنا۔ ادبی تقریبات میں شرکت کرنا۔ احباب کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنا۔

☆☆☆

عرضِ مرتب

کوئی افسانہ نگاری کو آسان سمجھے تو سمجھے مگر یہ ہے بڑا مشکل کام۔ کیونکہ افسانہ نگار سماجی حقائق کا ذکر کرے یا محض تصورات وخیالات کی اینٹوں سے افسانہ کی عمارت تعمیر کرے، دونوں صورتوں میں اُسے وہ اندازِ بیان اختیار کرنا ہوتا ہے جو کہ ایسا دلچسپ، لطیف اور پُر تاثیر ہو کہ قاری آغاز سے اختتام تک اکتاہٹ محسوس نہ کرے.......... جنھیں خیالات کو بُننا، الفاظ کو برتنا اور خیالات کو وسعت دینا نہیں آتا وہ کبھی کامیاب افسانہ نگار نہیں ہو سکتے۔

منظور پروآنہ صاحب شاعری بھی کرتے ہیں مگر وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ جب بھی کوئی نیا خیال آتا ہے۔ کوئی واقعہ یا حادثہ انھیں جھنجھوڑتا ہے وہ افسانہ لکھتے ہیں اور پھر کوئی بھی طاقت انھیں اس عمل سے روک نہیں پاتی۔ ورنہ وہ مختلف سمتوں میں فکر وخیال کے گل بوٹے سجانے میں مصروف ومنہمک رہتے ہیں۔ ادبی کتب پر موقر جرائد واخبارات میں تبصرے کرتے ہیں۔ مضامین اور شخصی خاکے وقفہ وقفہ سے سامنے آتے رہتے ہیں۔ نہ بہت زیادہ لکھتے ہیں نہ بہت کم بلکہ ان کی زندگی میں بڑا توازن اور ٹھہراؤ ہے۔ لااُبالی پن اور بہت زیادہ دوڑ دھوپ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی آپ کو مقصدیت ملے گی۔ قصبات ودیہات کی پرسکون زندگی، سادگی وخلوص کے مقابلتاً شہروں کا دم گھٹا دینے والا ماحول۔ ہر طرح کی آلودگی، کثافت بھری فضا اور تنگ وتاریک گلیاں، کالونی، کلچر، نئی نسل کی آرزوئیں، اُمنگیں، قدروں کی پامالی، فکروں کا تضاد، سب کچھ پروانہ صاحب کے پیشِ نظر ہے۔ یہی پروانہ

صاحب کے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں۔ پھر کیوں نہ ان کے افسانے زندگی سے بہت قریب تر ہوں۔

امید ہے ناقدین ادب ان کے افسانوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھیں گے اور عوام وخواص میں ان کی پزیرائی ہوگی۔

رضوان احمد فاروقی
جنرل سکریٹری
بزم اقبال محشر، لکھنؤ
فون رابطہ 76688260161

۱۱رمئی ۲۰۱۱ء

حرفے چند

اردو کو ہم دو حوالوں سے جانتے ہیں۔ایک حوالہ زبان ہے اور دوسرا ادب۔ تقسیم ملک کے بعد اردو زبان بے پناہ خسارہ میں رہی مگر اردو ادب نئی جہتوں اور نئے امکانات کا مبشر و معیار بن گیا اور خصوصیت کے ساتھ اردو افسانوں نے تقسیم ملک کے بعد جو بال و پر نکالے ہیں اور جس طرح اُس نے عالمی افسانوی ادب میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کرلیا ہے۔اگر تقسیم کا سانحہ نہ ہوتا تو شاید اردو افسانہ نئی جہتوں اور نئے امکانات کا مبشر و معیار نہ بن پاتا۔مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ جن بنیادوں پر آج ہمارے افسانوی ادب کا تاج محل کھڑا ہے وہ وہی ہے جس کی داغ بیل ترقی پسند تحریک کے قبل رومانی تحریک کے مشاہیر نے ڈال دی تھی اور جن کے افسانوں میں ایک خواب آور فضا اور رومانی کیف وسرور کی موجودگی کا احساس ملتا تھا۔جناب منظور پروانہ کے جو افسانے زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں اُن میں رومانیت ضرور ہے مگر اس کے باوجود وہ ''فراریت'' نہیں ہے جو رومانی ادیبوں اور شاعروں کے یہاں عموماً موجود رہتی ہے اور نہ ہی زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرا کر خواب وخیال کی ایک ایسی تصوراتی دنیا میں بھاگ جانے کی خواہش نظر آتی ہے جو کہیں موجود نہ ہو۔زیر نظر مجموعے میں شامل افسانوں کے پلاٹ ہماری زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے لئے گئے ہیں اور اُن کی پیش کش ایک ایسی صاف ستھری زبان میں کی گئی ہے جو آسانی کے ساتھ قاری کو اپنے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔اس طرح کے افسانے ممکن ہے کہ ''جدیدیت'' اور ''مابعد جدیدیت'' کے قلم کاروں

کے معیار نقد و نظر پر مکمل طور سے پورے نہ اتریں مگر ان کی بنیاد زندگی کے حقیقی واقعات اور ہمارے گرد و پیش بکھری ہوئی جو ناہمواریاں ہیں اُن پر رکھی گئی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' مگر اُس سے بڑا سچ یہ بھی ہے کہ محبت کے جذبات واحساسات روزِ ازل سے ہی ہماری فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں اور اسی ایک مرکزی نقطے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ناہمواریوں سے انسان روزِ ازل سے نبرد آزما ہے اور آج کا معاصر معاشرہ بھی ان سے نجات نہیں پا سکا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے دورِ حاضر کے افسانوں میں صاف شستہ معیار کی کمی پائی جاتی ہے۔ مگر منظور پروانہ کے افسانوں میں بڑا شگفتہ اور رواں دواں انداز بیان ہے جس کی تعریف نہ کرنا ایک بہت بڑی خوبی کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا۔

بعض کتابوں کے نام ہی اُس کے مشمولات کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ ''دستِ حنائی'' بھی ایسی ہی کتاب ہے۔ اور مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ صرف عام قاری ہی نہیں بلکہ ارباب ادب بھی اس کے پلاٹ، اندازِ بیان اور مجموعی طور پر اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ان کا یہ سفر خوب سے خوب تر کی جانب جاری رہے گا۔ پروانہ صاحب صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور دونوں حوالوں سے اُن کی خوش فکری ہمارے ادب میں اضافہ کا باعث بنے گی۔

ملک زادہ منظور احمد

دانش محل

۱۱ر جنوری ۲۰۱۲ء

اردو کہانی کی جادوگری

جلدی سے کچھ باتیں کرلیں، وقت بڑا طوفانی ہے
کیا قلمی تصویر کسی کی، سب کچھ آنی جانی ہے

خدا کو شاید یہی منظور تھا کہ پروآنہ، پولیٹکل سائنس کے سارے نئے پُرانے زخموں کو خوب اچھی طرح پرکھ لیں مگر عملی سیاست کی اندھی گلی سے ہمیشہ دور ہیں۔ اگر کہیں کھپنا بھی ہے تو اپنی عمرِ عزیز کا یادگار زمانہ ادب کی پرستش کے لئے وقف کردیں۔

کیا ددھیال کیا ننہال، منظور پروانہ کے دونوں گھرانوں میں شاعری کا روایتی ڈنکا بج رہا تھا۔ اور داغ دہلوی کی چٹ پٹی شاعری، شوق قدوائی کو گدگدا رہی تھی اور غزلیہ شاعری کے وِشال پاٹ دار دریا کے کنارے منظور پروآنہ کا قدرے سائنسی ذہن، اضطراب وتذبذب کا شِکار، اپنی ذات، اپنے فن کے اظہار کی خاطر اُردو کے افسانوی ادب کی طرف جُھک رہا تھا۔ اور سچا اضطراب تو کسی بھی فن کا مائی باپ ہے۔ منظور پروآنہ کی پہلی افسانوی کتاب ''دستِ حنائی'' ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ منظور صاحب عمر کی ۶۲ رخزاں رسیدہ بہاریں دیکھ چکے ہیں اور میں ایک بندۂ اردو، انگریز کے غلام ہندوستان میں زندگی کے دس برس کاٹ کے آج اپنی عمر کے ۷۳رویں سال کے انتم چرن (یعنی ۲۲ راکتوبر) کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہوں۔

ضروری ہے یہ اشارہ کہ برسوں ڈائری لکھتا رہا ہوں۔ دن بھر ہلکی پھلکی جیب سے کہاں کیا نکل گیا اور آنکھوں نے سفید کاغذ پر کالے حرفوں کے سمندر سے علم و حکمت کے کتنے موتی نکال کے اپنے سینے میں رکھ لئے، ریزہ ریزہ ڈائری میں جذب ہوتا رہا اور ایک دن معلوم ہوا کہ دس ہزار کہانیاں میری نظر سے گذر چکی ہیں۔ یقین ہے کہ سنِ رسیدہ ،ہوشمند، بالغ نظر منظور پروآنہ، نیک جذبے کے کچھ سیدھے صاف اشارے قبول کرنے میں جھجک محسوس نہیں کریں گے۔ یہ عمل بہت ہی بے تکا ہے کہ ہم دس ،بیس، کہانیوں کو مناسب ترین، رنگا رنگ عنوانات سے نوازتے رہیں مگر کتابی صورت میں ان کی یکجائی کے وقت ہماری تخلیقی صلاحیت جواب دے جائے، بانجھ ہو جائے اور ہماری سہل پسندی، کتاب میں شامل کسی ایک کہانی کے عنوان کو ہی، کتابی نام کی حیثیت سے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

دستِ حنائی کے پیچھے ۲۰ دوسری کہانیاں اپنے سیدھے سادے، غیر مبہم عنوانات کے ساتھ کھڑی ہیں۔ افسوس کہ پولیٹکل سائنس نے سماجی شعور کے جن بے لاگ رویوں کے درشن کرائے تھے وہ بھی اردو غزل کے منظور نظر پروآنہ کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی نہ لا سکے اور ترتیب میں پہلی کہانی کے صدیوں پُرانے رومانی عنوان کی مہندی ،افسانوی کتاب کے سرِ ورق پر پھیل گئی۔ آیئے اکیسویں صدی کے بظاہر بہت روشن، ترقی یافتہ تاریک پس منظر میں منظور پروآنہ کے سماجی سروکار کو سمجھ لیں اور ان کی افسانوی ہُنر مندی کو بھی ٹٹولتے چلیں۔

پہلی کہانی دستِ حنائی کی طرح، دوسری تخلیق کرکٹ بھی جنس دہ، اپنے پڑھنے والوں کو چٹخارے پرونے والی، دورِ حاضر کی زندگی کا ایک درپن، بنتِ حوّا کا یہ مکالمہ

سب کچھ کہہ گیا۔ ’’تم بھی عجیب اناڑی ہو، صرف فیلڈ کا جائزہ ہی لیتے رہتے ہو۔ مجھے تو جارح کھیل کھیلنے والے کھلاڑی پسند ہیں۔ ایک تم ہو کہ ہر کام سے پہلے جائزے اور نتائج کی تقسیم وضرب میں اپنا وقت برباد کرتے ہو۔ دوسرے کے جذبات سے کوئی مطلب نہیں۔‘‘

ادبی تقریبات میں شریک ہوتے رہنا منظور پرواؔنہ کے مشاغل کا ایک حصہ ہے اور تیسری کہانی احسان فراموش بالکل سامنے کی کلوز اَپ، آنکھوں دیکھا ایک حقیقی حادثہ ہے۔ چوتھے قدم کے پس منظر میں کہانی کار کو اپنے ہاتھ پیر نکالنے کا موقع ملا ہے۔ ’’اس آفر‘‘ کے بدلے میں تم کو اپنی ایک رات .... جملہ ادھورا چھوڑ کر باس نے پھر میری طرف دیکھا تو جملہ خود بخود پورا ہو گیا۔‘‘ خوبصورت ہے یہ اندازِ نگارش۔

پانچویں کہانی انصاف بکتا ھے میں کہانی کار بہت آگے نکل گیا۔ ’’کیا آپ نگیٹیو نہیں سوچ سکتے‘‘۔ یہ بات سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا کیونکہ ایک ذمہ دار افسر کا یہ جملہ اُس کے بدعنوان ہونے کا غماز تھا۔ یہ پانچویں کوشش ترتیب میں پہلی کہانی کی جگہ لے سکتی تھی۔

چار، پانچ کرداروں کے ساتھ چھٹا افسانہ زوال یا کمال بھی اسی لائق تھا کہ اُسے پہلی کہانی کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

اور ساتواں قدم "مسیحا" ایک بھرپور افسانہ۔ ’’میرے ذہن میں بار بار یہ سوال نشتر کی طرح چبھتا ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ کر مادی ترقی کے حصول کے لئے غیر ممالک میں پڑے رہتے ہیں، کیا انھیں علم ہے کہ اُن کی غیر موجودگی میں شیطان ان کے گھروں میں کیا گل کھلا رہا ہے۔‘‘

آٹھویں کہانی "آرزو" اسی خیال پر مہر لگاتی ہے کہ منظور پرواؔنہ کا سماجی سروکار،

نہایت شریفانہ اور تعمیری ہے۔ ''والدہ مُجھے اکثر سمجھاتیں کہ زمانہ خراب ہے اتنی آزادی اور فیشن اچھا نہیں۔ فیشن گھر کی چار دیواری تک تو مناسب ہے مگر جب یہ برسرِ عام ہوتا ہے تو مصیبت بن جاتا ہے۔''

گھڑی کی سوئیاں ، آٹھویں کہانی کے مقابلے میں بہت چھوٹی، مرد و زن کی نفسیات کو اُجاگر کرنے میں سوئیوں کی رفتار مددگار

ایک افسانچہ، ایک خواب جو کہانی نہ بن سکا۔

گیارہواں افسانہ دوھرا کردار اِس طنزیہ خیال کے ساتھ دلچسپ ہے کہ ''قانون بنانے کا مطالبہ کرنے کا اس کو حق حاصل ہے، جو قانون توڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔'' بارہواں افسانہ فریب نظر اپنے اختتام پر قارئین سے ایک قہقہہ تو لگوا ہی سکتا ہے۔ ''میں نے جسے ایک خوبصورت لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا حقیقت میں وہ ایک نوخیز ہجڑا تھا جس پر کچھ لوگ کئی خوبصورت لڑکیاں قربان کر سکتے تھے، مگر میرے پاس ایسی جرأتِ رندانہ نہیں تھی۔''

تیرہویں کہانی انتقام کے لئے بے شمار مبارکبادیاں۔ منظور پروآنہ اگر اس کہانی کو کبھی کبھار خود بھی پڑھتے رہیں گے تو ان کا قلم کئی آبدار کہانیوں کا رچنا کار بن سکے گا۔

پیغام سے معلوم ہوا کہ منظور پروآنہ کو کہانی بننا اور سُنانا خوب اچھی طرح آتا ہے اور یہ پندرہویں کہانی بلیک منی وھائٹ بچہ ،انتقام کی طرح بھرپور ہمدردی یاد شمنی ایک طنزیہ کہانی۔ ''تم بالکل جاہل ہو، حکومت کی رقم ہے واپسی کا کیا سوچنا''۔

''سماج اتنا بگڑ چکا ہے کہ اُسے ہم اکیلے نہیں بدل سکتے۔ پھر بھی یہ کیسا سماج؟ کی دہائی قبول فرمالیں۔''

خون کی ٹھیکیداری کی ایک ''سروے رپورٹ، کہانی بن گئی۔ پانچ دن

نرسنگ ہوم میں رہنے کے بعد جب پروانہ رُخصتی ملا تو اُس کے ساتھ ۲۲ ہزار ۶ سو اکتیس روپیوں کا بل لگا تھا۔ یہ بل صرف آپریشن کی فیس اور پانچ دن نرسنگ ہوم میں رہنے کا تھا۔ اس بل کو دیکھ کر مجھے خون کا ٹھیکیدار فرشتہ معلوم ہونے لگا اور نرسنگ ہوم والے خون چوسنے والے درندے۔''

اور انیسویں کہانی جو کہانی ہرگز نہیں ہے۔ تحریر ہے، ترجمان ہے''دستِ حنائی کے پیشکار اندر باہر سے یک رنگ، شرافت کی ہر کسوٹی پر کھرے اُترنے والے منظور پروانہ کی بہت ہی نجی وِچار دھارا کی۔ اور بندۂ اردو کے لئے بہت قیمتی ہے''زمین کی شاعری''جس نے اردو کہانی کی جادوگری کا جواز پیش کیا ہے۔ کیسے؟ اور اس بے تکے، کیسے؟ کا جواب ہے بس یہی شعر۔

ملتی ہے اشارات سے ہر حال میں تحریک
تفصیل سے ہر بات بتائی نہیں جاتی

اور سامنے کا ایک سچ یہ بھی ہے کہ آخر کی دو تحریریں بھی کہانی پَن سے دور ہیں۔ افسوس کہ "نئی سوچ" میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔

اور یہ دنت کتھا ان اشاروں کے ساتھ سمیٹی جا سکتی ہے کہ:

۱ ''دستِ حنائی''میں ۲۱ رعنوانات کے پردے میں صرف پندرہ کہانیاں ہمارے سامنے آئی ہیں۔

۲ صاحبِ کتاب کو اپنے معاشرے سے سیدھی سادی زبان میں بات کرنے کا سلیقہ مِلا ہے۔

۳ اور اسی سلیقے کے بھروسے پر زندگی میں کچھ یادگار اچھی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں۔

۴ اور اس راہ میں ضروری ہے کہ منظور پروانہ، ڈپٹی نذیر احمد کی نگارشات سے دور بھاگیں۔

۵ مگر لکھنؤ میں اردو افسانہ نگاری کی ''ناری تثلیث'' (عائشہ۔ مسرور۔ صبیحہ) کو نظر میں رکھیں۔ بشیشر پردیپ اور عابد سہیل دونوں کو پڑھتے رہیں، احمد ابراہیم علوی، محسن خان اور شاہ نواز قریشی کی سماجی سوجھ بوجھ اور فنی ہنرمندی کو ٹٹولتے رہیں۔

۶ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے دین، اپنے مذہب، اپنی زبان، اپنی تہذیب کی قلعہ بندیوں سے باہر نکل کر اپنے بے لاگ قلم کو افسانہ لکھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

دعائے خیر و برکت کے ساتھ بندۂ اردو

انور ندیم قیصر باری

۵/ستمبر ۲۰۱۰

MANJU NISHAAN
129.B.RAJEEV NAGAR
KANCHAN BEHARI MARG
KALYAN PUR
LUCKNOW.22

ادب کی اہمیت اور افادیت

ادب کو جز وقتی تفریح سمجھنے والے کبھی ایسے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے جس پر فخر کیا جا سکے یا جس سے بہت بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو سکیں۔ دنیا کی جن زبانوں میں نا قابلِ فراموش ادب کی تخلیق ہوئی اُن زبانوں کے ادیبوں نے انتہائی سنجیدگی اور انہماک سے تخلیق ادب کی ہے۔ ہمارے بھی بڑے ادیب کُل وقتی رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی، نیازؔ فتحپوری وغیرہ جیسے اہم نام اس لئے نا قابلِ فراموش ہیں کہ انھوں نے تخلیقِ ادب کو کُل وقتی کام سمجھا۔ اسی لئے ایسی شاہکار تخلیقات نکلیں کہ جن کی اہمیت وافادیت کو کبھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔

آج کیفیت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ادیب زندگی کے کاروبار کو چلانے کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں۔ جب وقت ملتا ہے شعر کہتے یا افسانہ لکھتے ہیں۔ ایسے میں وہ کس طرح ایسے ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں جس کو نا قابلِ فراموش کہا جا سکے؟

منظور پرواؔنہ نے اپنے کاروبارِ حیات کو چلانے کے لئے با قاعدہ ملازمت کی۔ جب کبھی وقت ملا کچھ لکھ لیا۔ اس میں نہ ان کا انہماک شامل رہ سکا اور نہ وہ ریاض کہ جس کے بغیر شعر ادب کی تخلیق ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے سے خوشی کے ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ کاش انھوں نے تھوڑا سا وقت نکال کر اس پر محنت کی ہوتی ان کے پاس اچھے اچھے موضوعات ہیں۔ کہانی لکھنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ زبان صاف شستہ اور آسان

استعمال کرتے ہیں۔کہانی سلیقے سے مگر بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔اس تیزی میں بہت سی باتیں رہ جاتی ہیں انھیں مکالمہ سازی، منظر کشی اور پُرکشش انداز میں کہانی کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے انجام تک پہنچادینے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔اس لئے جیسے ہی کہانی شروع ہوتی ہے ختم ہوجاتی ہے ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ کہانی پڑھی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جو کہانی لکھی گئی اس کا خلاصہ پیش کردیا گیا ہے۔

منظور پروآنہ صاحب کے بعض افسانے بڑے جاندار ہیں اور چونکا دیتے ہیں لیکن وہ جتنے دلچسپ ہیں اُس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہو سکتے تھے۔بس ذرا سی محنت درکار تھی۔

''دستِ حنائی'' ایک اچھی اور دلچسپ کہانی ہے۔اسی طرح منظور پروآنہ صاحب کی دوسری کہانیاں ہیں۔

انھیں کہانی بُننے اور سنانے کا فن آتا ہے۔بس اس فن سے مزید مستفید ہونے کی ضرورت ہے اگر انھوں نے تخلیقی کاموں کے لئے مزید وقت نکال لیا اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد خود کو کُل وقتی فن کار بنالیا تو ان کی کامیابی یقینی ہوگی اور ایک معقول اور ہردلعزیز فن کار بن کر رہیں گے۔

احمد ابراہیم علوی

اعتراف

تصورات کی وادی یقیناً بہت حسین ہوتی ہے اور دلفریب بھی اس قدر کہ اس سے فرار ناممکن ہوتا ہے مگر یہ سب انھیں کے ساتھ ہوتا ہے جو دن میں خواب دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ خدائے بزرگ برتر کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہوا بلکہ میرے ساتھ حالات اس کے بالکل برعکس رہے۔ جب سے ہوش سنبھالا، ذمہ داریوں کا بوجھ کاندھوں پر رہا۔ طالبِ علمی کے زمانے کے بعد ملازمت اور خانگی معاملات کی فرض ادائیگی نے مہلت ہی نہ دی کہ خواب دیکھتا اور سنجیدگی سے اپنی نثری کاوشوں کو کتابی شکل دینے کی طرف توجہ دے پاتا۔ حالانکہ برادرم رضوان فاروقی وقفہ وقفہ سے مجھے کتاب کی اشاعت کے لئے آمادہ کرتے رہے مگر ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے اور جس کام کا جو وقت متعین ہے وہ اسی وقت تکمیل پاتا ہے پھر راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔

وقت نے کروٹ لی اور جون ۲۰۰۸ء میں جب مجھے ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوئی تو برادرم رضوان فاروقی نے اپنے پُرانے مطالبہ کی یاددہانی کرائی۔ اس درمیان کچھ اور احباب نے بھی اس بات کے لئے توجہ دلائی۔ لیکن بے عملی حاوی رہی۔ ایک دن برادرم رضوان فاروقی نے اس قدر زور دیا کہ میری بے عملی کا محل ڈھیر ہوگیا اور میں نے تمام کہانیاں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تھیں ان کے حوالے کردیں۔

مجھے اس اعتراف میں کوئی ہچک نہیں ہے کہ میرے بکھرے ادبی سرمائے کو برادرم رضوان فاروقی نے بے پناہ خلوص، لگن اور محنت سے ترتیب دے کر اسے کتابی شکل دی ہے

ورنہ آج بھی یہ سب اسی طرح بکھرا ہی رہتا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اسے کتابی شکل دی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے تمام مراحل بھی انھیں کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر انھوں نے ہر قدم پر اپنی مخلصانہ اور بے لوث کاوش سے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو شاید یہ کتاب آپ تک نہ پہنچ پاتی۔

اس موقع پر مجھے اپنے بڑے والد مرحوم واحد علی لطفؔ لکھنوی اور مرحوم صغیر سحرؔ سندیلوی کی بے انتہا یاد آرہی ہے۔ جنھوں نے اوائل عمری میں میری نثری کاوشوں میں راہ نمائی فرمائی جس کے طفیل مجھے خود اعتمادی حاصل ہوسکی۔

کتاب میں شامل کہانیوں کے سلسلے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں نے سماج میں جو دیکھا، سنا، سمجھا، برتا اور مشاہدے میں جو آیا یعنی سماج نے جو مجھے دیا اسے میں نے کہیں آپ بیتی اور کہیں جگ بیتی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ میری کہانیوں کے کردار اسی سماج کے ہیں جو آپ کے لئے انجان نہیں ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے کہ میں کہاں تک کامیاب رہا۔

منظورؔ پروانہ

فہرست

دستِ حنائی

شبنم نے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ میرے دل کی دنیا زیر و بر ہونے لگی۔ میں نے اُس کا مہندی رچا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ویسے تو مجھے سب سے زیادہ جوہی کا پھول پسند ہے مگر تم سے ملاقات کے بعد سے ذہن میں گلاب ہی گلاب کھل رہے ہیں۔ بات چیت کے دوران میرے ہاتھ اس جسمانی گلاب کے نشیب وفراز کو تلاشنے کی جستجو کرنے لگے۔ پہلے تو..................................

دستِ حنائی

اتوار کا دن اور دسمبر کی ۲۴ رتاریخ تھی میں اپنے کاروباری سلسلہ میں ایک پارٹی سے بات کرنے کے بعد جب شام ساڑھے پانچ بجے برلنگٹن ہوٹل سے باہر نکلا تو بارش ہو رہی تھی میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور گھر کے لئے چل دیا۔ بازار بند تھا اور بارش کی وجہ سے راستے پر بھی سناٹا تھا۔ میں بارش کا لطف اٹھانے کے لئے آہستہ آہستہ کار چلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ کار جیسے ہی سول ہاسپٹل کے سامنے پہنچی کہ یکا یک سڑک پر ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی جو اپنے مہندی لگے ہاتھ سے کار روکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے کار روک دی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''معاف کیجئے گا بارش کی وجہ سے کوئی سواری نہیں مل رہی ہے۔ اگر آپ علی گنج کی طرف جا رہے ہوں تو مجھے بھی لیتے چلئے''۔ لڑکی نے مترنم آواز میں کہا۔

''میں آئی۔ ٹی۔ کالج چوراہے تک آپ کو چھوڑ سکتا ہوں اگر آپ چلنا چاہیں تو چلیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں وہاں سے کسی دوسری سواری سے چلی جاؤں گی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

میں نے کار کا دروازہ کھولا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ اپنے بھیگے لباس کی وجہ سے ہچکچا رہی تھی میں نے دوبارہ کہا فکر نہ کیجئے بیٹھ جائیے۔ حقیقت یہ تھی کہ لڑکی کے خوبصورت ہاتھ، مترنم آواز اور بھیگی ساڑی میں لپٹا ہوا بدن میرے دل ودماغ پر چھا گیا تھا اور میں اس کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے دوبارہ کہنے پر لڑکی بہت احتیاط سے میرے بغل میں بیٹھ گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور چل دیا مگر ہوا کی تیزی اور بھیگے لباس نے لڑکی کے جسم میں کپکپی پیدا کردی۔ میں نے سوچا کچھ دیر ساتھ رہنے کا یہ موقع غنیمت ہے۔

''ارے آپ تو کانپ رہی ہیں۔ چلئے پہلے کسی ریسٹورینٹ میں گرم گرم کافی سے جسم کو گرما لیا جائے پھر چلا جائے۔'' میں نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں......ایسی کوئی ضرورت نہیں جاڑے میں ٹھنڈ تو لگے گی ہی۔'' اس نے کھنکتی آواز میں جواب دیا۔ لیکن جب میں نے کار کو ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکا اور اس سے باہر آنے کو کہا تو وہ انکار نہ کرسکی۔ ریسٹورنٹ میں پہونچ کر میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ کافی آنے تک ہمارے درمیان سکوت رہا۔ لیکن کافی کی چسکی کے ساتھ میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔'' آپ کا نام کیا ہے؟''

''مجھے شبنم کہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن اس بھیگی گلابی ساڑی میں تو آپ شبنم میں نہایا گلاب لگ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ کافی کی چسکیوں کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس طرح کافی ختم ہوتے ہوتے اجنبیت بھی ختم ہو چکی تھی۔ بل ادا کرنے کے لئے میں نے پرس سے نوٹ نکال کر ویٹر کو دیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر شبنم سے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد میں نے کار اسٹارٹ کی اور چل دیا۔ کار اسٹیڈیم کے قریب پہونچی تھی کہ اچانک بارش کی رفتار نے شدت اختیار کرلی۔ راستوں پر پانی بھر گیا۔ میں

نے کار املی کے سایہ دار درخت کے نیچے روکتے ہوئے کہا۔ ''قدرت نہیں چاہتی کہ ہم جلد جدا ہوں۔ دیکھئے بارش تیز ہوتی جا رہی ہے یہ طوفان کم ہو تو چلوں۔''

میری اس بات پر شبنم نے میری طرف کچھ اس طرح سے دیکھا کہ میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ میں نے اس کا مہندی رچا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ویسے تو مجھے سب سے زیادہ جوہی کا پھول پسند ہے مگر تم سے ملاقات کے بعد سے ذہن میں گلاب ہی گلاب کھل رہے ہیں۔ بات چیت کے درمیان میرے ہاتھ اس جسمانی گلاب کے نشیب و فراز کو تلاشنے کی جستجو کرنے لگے۔ پہلے تو شبنم نے احتیاط برتی اور فاصلہ قائم رکھا مگر کچھ وقفہ بعد ہی اس کا سر میرے کاندھوں پر آ گیا اور اس کا ہاتھ بھی میرے جسم پر رقصاں ہو گیا۔ مجھ پر ایک نشہ سا چھانے لگا مگر بارش کی رفتار کم ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ مجبوراً میں نے کار اسٹارٹ کی اور چند منٹوں میں ہی شبنم کو آئی۔ ٹی۔ کالج چوراہے پر چھوڑ دیا۔

شبنم نے ایک رکشا بلایا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے علی گنج کے لئے روانہ ہو گئی۔ میں دور تک رکشے کو جاتا دیکھتا رہا۔ رکشا نظروں سے اوجھل ہوا تو میں بھی بے دلی سے کار میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کی چند گز کی مسافت طے کی اور اپنی کوٹھی پر جا پہنچا۔ کار سے اتر کر برآمدے میں جاتے ہوئے جب میں نے کار کی چابی جیب میں ڈالی تو احساس ہوا کہ میرا پرس جیب میں نہیں ہے۔ میں لوٹ کر کار تک آیا اور پرس کو تلاش کرنے لگا مگر پرس تو غائب ہو چکا تھا۔

اسی لمحہ میری نظروں میں اس خوبصورت لڑکی کے دستِ حنائی ناچنے لگے اور میں دستِ حنائی کے اس شاندار کارنامے پر حیرت زدہ سا ہو گیا۔

☆☆☆

کرکٹ

ریڈیو پر کمنٹیٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بلے باز نے ایک اچھی پاری کھیلی مگر محتاط نہ رہ سکا اور سرف ۶۸ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا۔

کرکٹ

ورلڈ کپ کے شروع ہوتے ہی رجنی اور رمیش پر بھی کرکٹ کا بخار پورے شباب پر تھا۔لیکن یہ دونوں میچ کو ٹیلی ویژن پر دیکھنے کے بجائے ریڈیو پر کمنٹری سننے کے زیادہ عادی تھے اور یہ عادت ان پر بھوت کی طرح سوار تھی۔آج بھی وہ دونوں ایک کمرہ میں بیٹھے ریڈیو سے نشر ہونے والا آنکھوں دیکھا حال سن رہے تھے۔کھیل میں ابھی تک جان نہیں آئی تھی اس لئے دونوں خوش گپیوں میں مشغول تھے اسی بیچ آوٹ ہونے والے کھلاڑی کی جگہ پر آنے والے بلے باز کے سلسلے میں کمنٹیٹر نے کہا ''کھیل اب دلچسپ مرحلے میں پہنچ رہا ہے کیونکہ جو کھلاڑی اب بلے بازی کے لئے میدان میں آرہا ہے وہ ہمیشہ سے جارحانہ کھیل کھیلنے کے لئے مشہور ہے۔

بلے باز کا نام اور کمنٹیٹر کا ریمارک سن کر رجنی نے رمیش کو مخاطب کر شوخی سے کہا۔''مجھے ایسے ہی کھلاڑی پسند ہیں تیز اور جارح.........'' رجنی کا جملہ پورا بھی نہ ہوا کہ انھیں کمنٹیٹر کی آواز نے متوجہ کر لیا جو کہہ رہا تھا ''یہ ایک اچھی گیند اور اس کو بلے باز نے بیک فٹ پر

جا کر بہترین ہک کیا اور گیند ہوا میں باؤنڈری پار کرگئی اور یہ امپائر کا اشارہ چھکا......''

اس سکسر کی خوشی میں، کہتے ہوئے رمیش نے لپک کر رجنی کا بوسہ لینا چاہا تو روٹھتے ہوئے بولی۔''تم بھی عجب اناڑی کھلاڑی ہو صرف فیلڈ کا جائزہ ہی لیتے رہتے ہو مجھے تو جارح کھیل کھیلنے اور تیز اسکور کرنے والے کھلاڑی پسند ہیں جو وقت نہیں گنواتے بلکہ لگاتار چوکے، چھکے اڑاتے ہوئے تیز رفتار کھیل کھیل کر فرصت کرتے ہیں، ایک تم کہ ہر کام سے پہلے جائزے اور نتائج کی تقسیم وضرب میں اپنا وقت برباد کرتے ہو۔ دوسرے کے جذبات سے کوئی مطلب نہیں۔''

رمیش پر رجنی کی اس تلخ گوئی کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میں ایک محتاط کھلاڑی ہوں اس لئے فیلڈ کا جائزہ لئے بغیر ہوا میں بلا نہیں چلاتا تاکہ لمبی پاری کھیل سکوں اور لطف بھی آئے مگر یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ تمھاری فطرت اتنی ہیجانی ہے اور پسند اتنی جذباتی۔ اگر ایسا ہے تو آؤ اور دیکھو میرا کھیل............''

رمیش نے کھیل شروع کیا اور محتاط کھلاڑی کی طرح گیند پر اپنی نظر جما کر فارورڈ اسٹروک لگانے لگا۔ وکٹ نے ساتھ دیا گیند پر اس کی پکڑ مضبوط ہوتے ہی وہ بھی جارحانہ کھیل پر اتر آیا۔ چوے اور چھکے اس طرح لگ رہے تھے گویا تمام ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا اور آؤٹ ہوگیا۔

ریڈیو پر کمنٹیٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔''بلے باز نے ایک اچھی پاری کھیلی مگر محتاط نہ رہ سکا اور صرف ۶۱ رن بنا کر آؤٹ ہوگیا۔''

رمیش نے رجنی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پوچھا کیا خیال ہے سنچری نہ بنا سکا۔

منظور پروانہ

''صرف سنچری ہی کامیابی کا پیمانہ نہیں ہے سنچری نہ بنی کوئی بات نہیں کھیل تو اوریجنل اور جاندار کھیلا۔'' یہ کہتے ہوئے رجنی کے چہرے پر صرف مسکراہٹ ہی نہیں تھی بلکہ وہ بالکل مطمئن اور مسرور نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

احسان فراموش

آج جس طرح رفعت نے مجھے نظر انداز کیا۔ دانستہ طور پر مرے نام تک سے گریز کیا۔ اس نے مجھے اس قدر دل برداشتہ کیا کہ نا قابلِ بیان ہے۔

احسان فراموش

''آداب عرض ہے۔'' ایک مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے راکیش آتے نظر آئے۔

''کس خیال میں مگن ہو'' کہتے ہوئے راکیش جب قریب آئے تو فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''جاڑے کے موسم میں پسینہ۔ خیریت تو ہے؟ آپ یہ ہار لئے باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''آ...... آں...... نہیں...... ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ ابھی تک میں ہال ہی میں تھا مگر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہاں میرا بیٹھا رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مجھے اس بات کا تجربہ ہوا کہ حالات کس طرح پھول کو انگارہ بنا دیتے ہیں۔ گلاب کے یہ سرخ پھول اب سرخ انگارے ہیں، اور ان کی تپش سے ہی پسینہ چھلک آیا ہے۔'' میں نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

میرا جواب راکیش کو مطمئن نہ کر سکا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے ہوٹل کی طرف بڑھے کہ ٹھنڈ بہت ہے چلئے کافی پی جائے۔ سردی کی رات ہوٹل میں بھیڑ تھی مگر اتفاق سے کارنر سیٹ خالی تھی۔ راکیش اس سیٹ پر بیٹھ گئے میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ویٹر

فوراً پانی کے ساتھ حاضر تھا۔ راکیش نے کافی کا آرڈر دیا۔ میں نے ہار میز پر ڈال دیا اور پانی کا گلاس ہونٹوں سے اس طرح لگالیا۔ جس طرح ایک تشنہ میکش جام کو چوم لیتا ہے۔

پانی پی کر کچھ سکون ملا۔ ویٹر نے کافی لا کر رکھ دی تھی۔ اس بیچ راکیش بالکل خاموشی اختیار کیے رہے۔ کافی کی پہلی چسکی کے ساتھ ہی انھوں نے سوال کیا۔

''ہاں۔ اب بتاؤ! کیا کہہ رہے تھے؟ پھول کیسے اور انگارے کیا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آج کے فنکشن سے تو آپ کو خوش ہونا چاہئے مگر آپ بے چین نظر آرہے ہیں۔ آخر کیوں؟''

''آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ واقعی میں بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔''

راکیش کے سوال پر میں نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے یکایک ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ جن کا آپ نے تصور بھی نہ کیا ہو، تو بے چینی تو ہوگی ہی......''

''لیکن آج ایسا کیا ہو گیا؟'' راکیش نے بیچ ہی میں سوال اچھال دیا۔

''ابھی آپ ہی کہہ رہے تھے کہ آج مجھے خوش ہونا چاہئے۔ آخر کیوں خوش ہونا چاہئے؟'' میں نے سوال کے جواب میں راکیش سے سوال کر دیا۔

''اس لئے خوش ہونا چاہئے کیونکہ آج رفعت کو جو مقام حاصل ہے اور سماج میں جو وقار ہے وہ سب آپ کی دین ہے آپ نے ان کو ترقی کا زینہ ہی نہیں دکھایا بلکہ ہر قدم پر پورا تعاون دیا۔ آپ کی بدولت رفعت اس سرکاری ادبی ادارہ کے سربراہ بن گئے جسے وہ اپنی زندگی کی معراج مانتے تھے۔ آج کا فنکشن ان کے اعزاز میں ہو رہا ہے۔ اپنے شجر کو ثمر آور ہوتے دیکھ کر یقینی طور پر آپ کو خوش ہونا چاہئے۔'' راکیش پورے جوش میں بول رہے تھے۔

لیکن......سنو......میں نے کہا یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اکثر جن لوگوں کو آپ زینہ بہ زینہ سہارا دے کر بلندی پر پہنچاتے ہیں اور ہر طرح راہ نمائی کر کے آگے بڑھنے میں مدد

کرتے ہیں۔ منزل پانے کے بعد وہ اپنے محسن کو کامیابیوں کے نشے، حاشیہ برداروں اور مفاد پرستوں کے ہجوم میں فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ بھی ہوا مگر مجھے کبھی پریشانی نہ ہوئی...... مگر...... آج جس طرح رفعت نے مجھے نظر انداز کیا۔ دانستہ طور پر میرے نام تک سے گریز کیا اس نے مجھے اس قدر دل برداشتہ کیا جو نا قابلِ بیان ہے یہی نہیں بلکہ ادب کے مافیاؤں کے ہجوم میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سامعین کے صف میں بیٹھے اپنے محسن کو بھی نہ پہچان سکا۔ بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو بھی غنیمت ہوتا۔ مگر رفعت نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''آج میں جس مقام پر ہوں اپنی جدو جہد اور اپنی محنت سے ہوں۔ میں نے جو بھی کامیابیاں حاصل کیں اس کے لئے میں نے کبھی بیساکھی کا سہارا نہیں لیا میں کسی کا مرہون منت نہیں۔ لیکن آج کچھ لوگ میری کامیابیوں سے جل رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ میری کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھ لیں۔''

ان الفاظ نے مجھے یہ احساس کرادیا کہ رفعت نے لفظوں کی بیساکھی سے اپنے قد کو اس قدر اونچا بنالیا ہے کہ اب یہ ہار میں اس کے گلے میں نہ ڈال سکوں گا۔ یہ سوچتے ہی میں ہال سے باہر نکل آیا۔ بے خیالی میں میری نظر ان پھولوں پر پڑی تو یہ انگارے نظر آرہے تھے۔''

''احسان فراموش۔'' میرے خاموش ہوتے ہی راکیش نے بے ساختہ کہا۔

نہیں...... غلطی میری ہے میں ہی نادان تھا ہر شے اپنے اصل کی طرف ہی لوٹتی ہے کچھ لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ مگر کیا کیا جائے؟ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے میں اپنی فطرت سے مجبور۔ یہ کہتے کہتے میری نظر گھڑی پر گئی تو ایک بج رہا تھا میں خاموش ہو گیا۔ مگر اب میری بے چینی ختم ہو چکی تھی۔ ہم دونوں اٹھے اور ایک دوسرے سے الگ اپنے اپنے خیال میں گم اپنے گھروں کی طرف چل دئے۔

☆☆☆

پس منظر

یادرکھو! اس دور میں کرسی یا دولت نہیں ہے تو کوئی عزت نہیں۔ میری عزت صرف اس لئے ہے کہ میں اس فرم کا منیجر ہوں۔ دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

پس منظر

شام کے پانچ بج رہے تھے آفس کے لوگ گھر جانے کی تیاری میں تھے۔ میں نے بھی ٹفن اور بیگ اٹھایا اور گھر جانے کے ارادے سے کرسی چھوڑ کر اٹھی ہی تھی کہ چپراسی نے آ کر کہا۔ ''آپ کو صاحب یاد کر رہے ہیں۔''

''اچھا''! کہہ کر میں ٹفن اور بیگ کاندھے پر لٹکائے ہوئے باس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ باس نے اشارے سے بیٹھنے کو کہا تو میں بیٹھ گئی۔

باس نے فائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہنا شروع کیا۔

''میں نے تم کو اس وقت اس لئے بلایا ہے کہ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ شاید تمھیں اس بات کا علم ہو کہ فرم میں میری مدتِ ملازمت صرف دو سال باقی ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس مدت میں تم کو اس فرم میں اچھا مقام دلاوں۔ یاد رکھو اس دور میں کرسی یا دولت نہیں ہے تو کوئی عزت نہیں۔ میری عزت صرف اس لئے ہے کہ میں اس فرم کا منیجر ہوں۔ دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔''

اپنی بات پوری کرتے ہوئے باس نے میری طرف ایسی ہوس ناک نظروں سے دیکھا جس نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ مگر میں چپ رہی باس نے تھوڑے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

''اگلے ماہ فرم کی آل انڈیا ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ شملہ میں ہے جس میں مجھے بھی شریک ہونا ہے ٹور میں مجھے اپنے ساتھ ایک پرسنل سکریٹری بھی لے جانا ہے۔اس وقت یہ جگہ خالی ہے۔میری نظرِ انتخاب تم پر ہے۔مگر یہ جب ہی ممکن ہے جب تمہارا پرموشن ہو جائے۔اس پرموشن سے تم کو پانچ سو روپیہ کا ماہانہ فائدہ پوری نوکری میں ملے گا۔یہ کام میرے ہاتھ میں ہے مگر اس کے لئے تمھاری رضامندی ضروری ہے کیونکہ اس آفر کے بدلے میں تم کو اپنی ایک رات............''جملہ ادھورا چھوڑ کر باس نے پھر میری طرف دیکھا تو جملہ خود بخود پورا ہو گیا۔''سوچ لو یہ معمولی آفر نہیں ہے۔میں تمھارا پرموشن پہلے کر دوں گا۔تم کو اپنا وعدہ شملہ میں پورا کرنا ہوگا۔''

میں ساری باتیں سنتی رہی۔مٹی کی مورت کی طرح خاموش۔اس بیچ باس نے فائل بند کی اور میری کرسی کے قریب آکر بولے۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔میں زبردستی کا سودا نہیں کرتا۔اس دفتر کی کئی لڑکیاں ایسی ہیں جو یہ آفر قبول کر سکتی ہیں۔میں کسی سے بھی انجوائے کر سکتا ہوں۔مگر میری پسند تم ہو۔ویسے تمھاری مرضی۔گھر جا کر ٹھنڈے دماغ سے سوچنا۔ایک ہفتہ کا وقت ہے مگر یاد رہے تمھاری نوکری میرے ہاتھ میں......ہے۔''

باس کمرے سے باہر جا چکے تھے۔میں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے دل ہی دل کہا نوکری میری جوتی کی نوک پر ہے۔اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی مگر چہرے کی رنگت دل کا حال بتا رہی تھی۔بس میں بیٹھ کر کچھ سکون ملا مگر ذہن میں باس کا جملہ گونج رہا تھا''تمھاری نوکری میرے ہاتھ میں ہے۔''کنڈکٹر کی آواز پر میں چونکی اور خود کو سنبھالتے ہوئے بس سے اتر کر گھر کی طرف چل دی۔گھر پہنچی تو ماتا جی نے میری حالت دیکھ کر پوچھا۔''کیا بات ہے تم بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں بس سر درد بڑھ گیا ہے اس لئے چہرہ اترا ہے۔''میں نے بات بنائی

''منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ چائے لاتی ہوں پی لو اور ڈاکٹر سے دوا لے آؤ'' ماتا جی نے کہا۔ ''نہیں دوا کی ضرورت نہیں بس چائے مل جائے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ آرام کرنے سے درد کم ہو جائے گا۔ رات کا کھانا بھی نہیں لوں گی میں سکون سے سونا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھونے سے کچھ راحت ملی۔ ماتا جی چائے لے کر آگئیں۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ ماتا جی کے جاتے ہی میں بستر پر دراز ہو گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی یادِ ماضی ستانے لگی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ وہ بھی کیا وقت تھا جب پتا جی اس فرم کے منیجر تھے اور آج...... یہ سوچتے ہی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے یہ شخص جو آج میرا باس ہے میرے پتا جی کے حاشیہ برداروں میں تھا۔ خدمت گذاری میں لگا رہتا تھا۔ پتا جی نے بھی اسے برابر ترقی کے مواقع فراہم کرائے آخر یہ ڈپٹی منیجر ہو گیا۔ مگر اس کی روش نہ بدلی، صبح و شام گھر پر حاضری ضرور دیتا۔ لیکن...... چھ ماہ قبل پتا جی کی اچانک موت نے ہم سب کو بے سہارا کر دیا۔ اس برے وقت میں بھی اسی نے سہارا دیا۔ کچھ دن بعد اس نے ماتا جی کو سمجھایا کہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہوگا۔ آپ نوکری کر نہیں سکتیں۔ بیٹا بہت چھوٹا ہے بڑی بٹیا ہی پڑھی ہے اور نوکری کر سکتی ہے۔ ماتا جی تیار نہیں تھیں مگر اس نے کہا اب نوکری کرنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ سوچئے نوکری نہیں کرے گی تو خرچ کیسے چلے گا۔ آخر ماتا جی نے ہار مان لی۔ مجھے نوکری کی اجازت مل گئی۔ چونکہ اب یہی فرم کا منیجر تھا اس لئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ پتا جی کے سورگ باس کے دو مہینہ کے اندر مجھے نوکری مل گئی۔ اس طرح یہ میرا باس بن گیا۔ میں خوش تھی کام بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ صرف باس کے پاس آئی ڈاک کھول کر پڑھنا اور اس پر باس جو کاروائی کرنے کا حکم دیں اسے لکھ کر متعلقہ کلرک کو بھیج دینا۔ مگر مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا کہ جتنی دیر میں باس کے پاس ہوتی باس برابر مجھے ہی دیکھتے رہتے۔ لیکن میں پتا جی کے وفادار رہے اس شخص پر شک نہ کرتی۔ اس لئے

اس بات کو کبھی اہمیت ہی نہ دی مگر آج کے واقعہ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کروں کبھی میرے سامنے ماں کی بیماری، بہن بھائی کی تعلیم کا مسئلہ سامنے آتا۔ کس طرح ہر ماہ تنخواہ ملنے پر وہ سب اپنی اپنی مہینہ بھر کی خواہشات اور ضروریات کو اس امید کے ساتھ بتاتے کہ اب وہ پوری ہو جائیں گی۔ میں سوچتی باس کا آفر نہ مانا تو نوکری بھی ختم ہو جائے گی۔ گھر کا پورا نظام بگڑ جائے۔ باس کا کیا بگڑے گا۔ اگر میں نہیں تو کوئی اور...... پرسنل سکریٹری بن جائے گی اگر میں اس کل جگ میں ستی ساوتری بنی بھی رہوں تو کون میری قدر کرے گا بلکہ مصیبتیں ہی مقدر بن جائیں گی۔ نہیں ایسا مت کرنا۔ میرا ضمیر ٹوکتا مگر پھر سوچتی اگر آفر نہ مانوں گی تو گھر کا کیا ہوگا۔ نہیں اور ہاں کی یہ جنگ میرے اندر کب تک چلتی رہی اور کب میں نیند کی آغوش میں چلی گئی پتہ ہی نہ چلا۔

دوسرے دن صبح اٹھی تو ایک فیصلہ کر چکی تھی گھر کے افراد کی خوشی کو برقرار رکھنے کے لئے میں باس کے آفر کی صلیب پر اپنے کو قربان کر دوں گی۔ آج میں پورے اعتماد کے ساتھ دفتر کے لئے چل دی۔ حالانکہ مجبوریوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں نے آفر قبول کر لیا۔ میرا پرموشن ہو گیا۔ باس کے ساتھ میں شملہ بھی گئی۔ باس نے کولڈ ڈرنک میں نشے کی گولی ڈال کر پلا دی اور اسی حالت میں رات اپنے نام کر لی۔ دوسرے دن کافی دیر سے آنکھ کھلی بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ذہن ماؤف سا تھا مگر واپسی کا پروگرام طے شدہ تھا لہٰذا کسی طرح واپسی کے لئے تیار ہو گئی۔

ایک دن کے وقفہ کے بعد جب میں آفس گئی تو آفس کی رفتار پہلے جیسی ہی تھی۔ میں جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں چپراسی نے آکر بتایا کہ باس یاد کر رہے ہیں میں تھکی تھکی باس کے کمرے میں پہنچی تو انھوں نے کہا۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے''میں نے جواب دیا

''ڈاک ڈھیر ہے کھولو'' باس نے کہا۔

ڈاک میں سب سے اوپر باس کی بیٹی کا لفافہ تھا۔

''سر یہ آپ کی ڈاٹر کا لیٹر ہے''میں نے لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا

''پڑھو دیکھو کیا فرمائش ہے''۔باس نے میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔میں نے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

ڈیر فادر۔میں آج بہت خوش ہوں۔اس خوشی میں آپ کو شیئر کرنے کے لئے بتا رہی ہوں کہ فرم میں مجھے پرموشن مل گیا ہے۔میرے باس نے میری کارگذاری سے خوش ہو کر مجھے آؤٹ آف ٹرن پرموشن دیا ہے اس کے لئے میں خاص طور پر ان کے ساتھ ممبئی ہیڈ آفس گئی تھی۔ایک ہفتہ بعد آج ہی واپس آئی ہوں۔اس پرموشن سے ایک ہزار روپیہ ہر ماہ پرافٹ ہوگا۔

او۔کے بائی بائی

یور ڈاٹر

خط پڑھ کر میں نے باس کی طرف دیکھا تو وہ کرسی پر نہ تھے بلکہ کھڑکی سے باہر خلاؤں میں جانے کیا ڈھونڈ رہے تھے اور میں لفافہ میز پر رکھ کر اپنے پرموشن سے باس کی لڑکی کے پرموشن کا موازنہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر آگئی۔میری ساری تکان مٹ گئی تھی مسکراہٹ میرے لبوں پر مچلنے لگی تھی۔

☆☆☆

انصاف بکتا ہے

تم جو ضمیر ضمیر کی رٹ لگائے ہو تم کو اس کا علم نہیں کہ آج کے اس ضمیر فروشی کے دور میں اب ضمیر بکتے بکتے اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کہاں کہاں اس کا ضمیر بک چکا ہے۔

انصاف بکتا ہے

حسب معمول آج بھی جب میں آفس پہنچا تو کمرہ بند تھا۔ میں نے اپنی چابی سے کمرہ کھولا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنے کا ارادہ کررہا تھا کہ چیف کے چپراسی نے آکر اطلاع دی۔

''آپ کو چیف صاحب یاد کررہے ہیں۔''

''اچھا'' میں نے کہا۔ چیف صاحب سے ملاقات کے لئے میں ان کے کمرے میں جیسے ہی داخل ہوا انھوں نے ایک فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟ آپ کی سب فائلوں پر کیس کو ختم کرنے کی سفارش ہی ہوتی ہے۔''

''کیس ہسٹری۔ جانچ رپورٹ اور جانچ آفیسر کی جانچ کے نتائج اور ان کے ذریعہ کی گئی سفارش کے مطابق ہی میری رائے ہوتی ہے۔'' میں نے کہا

''کیا آپ نگیٹیو نہیں سوچ سکتے؟'' انھوں نے کہا۔

یہ بات سنکر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ کیونکہ ایک ذمہ دار افسر کا یہ رجحان اس کے بدعنوان ہونے کا غماز تھا۔

''میری سمجھ میں جو صحیح تھا وہ میں نے لکھ دیا۔ اب آپ جو مناسب سمجھیں آرڈر کردیں۔ آپ تو حاکم اعلیٰ ہیں۔'' میں نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا اور لوٹ آیا۔

اس واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کیا اس حد تک گر سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ دن تو دفتر کے کاموں کی مصروفیت میں کٹ گیا مگر رات کو بستر پر لیٹتے ہی ذہن پر وہی واقعہ گردش کرنے لگا اور میں اسی سوچ میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سامنے حضرت ابلیس ایک ہیولے کی شکل میں موجود ہیں۔ جیسے ہی میری نظر ان سے ملی انھوں نے بغیر کسی رسمی بات چیت کے سیدھا وار کیا اور کہنے لگے۔ تم بھی بالکل نادان ہو۔ اتنے معمولی سے واقعہ پر پورا دن برباد کیا اور رات کو بھی اسے ذہن پر مسلط کر کے اپنی رات برباد کرنے پر تلے تھے۔ کیا تم کو نہیں معلوم؟ اصول، فرائض، اخلاقیات، ملک سے وفاداری اور حرام وحلال یہ سب وہ باتیں ہیں جو محض کتابوں میں درج ہیں۔ آج کی مادہ پرست دنیا کے لئے یہ کھوٹے سکے ہیں جن کا چلنا بہت مشکل ہے۔ تم جو ضمیر کی رٹ لگائے ہو تم کو اس کا علم نہیں کہ آج کے اس ضمیر فروشی کے دور میں اب ضمیر بکتے بکتے اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں انسان کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کہاں کہاں اس کا ضمیر بک چکا ہے۔ اگر تم کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ آج نہیں تو کل تم میری باتوں پر ایمان لے آؤ گے۔ جب تم کو بار بار ایسے مراحل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم جس کو انسانوں کا جوہر ذاتی سمجھ رہے ہو وہ ایمانداری تمھارے کام نہ آئے گی بلکہ تمھارے لئے تمھاری ایمانداری ہی گلے کا پھندا بن جائے گی اور تم دنیا میں چلنے والے سکوں کو استعمال کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ اگر زیادہ سخت بننے کی کوشش کی تو ٹوٹ جاؤ گے۔ میں تم کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ غور سے سنو اور عبرت پکڑو کہ جس دنیا میں ایسے واقعات روزمرہ کے معمول بن گئے ہوں وہاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے چین ہونا کیا کوئی عقل مندی ہے؟

''یہ واقعہ زوالستان کا ہے۔'' حضرت ابلیس نے اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔

''زوالستان'' یہ زوالستان کیا ہے میں نے پوچھا۔

یہ ایک ملک ہے جو اسی دنیا میں ہے جو پہلے ''عروجستان'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ملک ساری دنیا کے لئے اخلاقیات کا نمونہ تھا۔ شرافت، انسانیت، بھائی چارگی اور محبت کا گہوارہ تھا۔ انسانیت کا عملی نمونہ یہ ملک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ملک میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔ میرا مشن ناکام تھا۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہ تھا برابر اپنے مشن میں لگا رہا۔ دھیرے دھیرے میری محنت رنگ لانے لگی میرے پیروکار بڑھنے لگے۔ آخر کار اس ملک میں اخلاقی قدروں کی قبائیں اور انسانیت کی ردائیں اس طرح تار تار ہوئیں کہ پوری انسانیت ننگی ہوگئی اور ملک میں پوری طرح میری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس زوال کی وجہ سے باقی دنیا نے اسے زوالستان کا نام دے دیا۔ اسی ملک کے شہر ننگ پور میں ایک تاجر نے اپنی بیوی کو اس لئے قتل کر دیا کہ اس نے ایک تجارتی آرڈر کو حاصل کرنے کے لئے نذرانے کے طور پر اس آفیسر کے بستر کی زینت بننے سے انکار کرنے کی جرأت رندانہ کی تھی۔ حالانکہ تاجر نے نذرانے کے لئے ایک دوسری بھٹی کا انتظام کر اس آرڈر کو حاصل کر لیا تھا۔ مگر اس بھٹی کے ایندھن کے روپ میں جو رقم خرچ ہوئی اس نقصان کے ردِ عمل میں یہ قتل ہوا تھا۔

قانون کی کتابوں میں لکھے قانون کے مطابق تاجر کو گرفتار کیا گیا۔ رسمی خانہ پری ہوئی اور تاجر نے دولت کے بل بوتے پر ایک وکیل کے ذریعہ جیل جانے سے پہلے ہی ضمانت حاصل کر لی۔ مقدمہ چلا۔ گواہوں کے بیان ہوئے اور عینی گواہ جو ایک بچہ تھا اس کا بھی بیان ہوا۔ زیادہ تر گواہ وکیل صفائی کی جرح کی جھاڑیوں میں پھنس کر راستہ بھول گئے اور مجروح ہوگئے دونوں وکیلوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں وکیل صفائی نے اپنے

موکل کے دفاع میں قانون کی ایک موٹی کتاب جج صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''می لارڈ! اس کتاب کے صفحہ نمبر ۹۹۔ ۳۰۵ اور ۴۲۰ کو ملاحظہ فرمائیں ان صفحات پر میں نے جو نشان لگائے ہیں وہ نظیریں ایسی ہیں جن کی روشنی میں میرے موکل کو باعزت بری ہونا چاہئے۔''

جج صاحب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کتاب کو ذرا نیچے کر نشانات لگے صفحات کو کھولا تو ہر صفحہ پر نشانی کے روپ میں اس ملک کی کرنسی کا سب سے بڑا نوٹ رکھا تھا۔ جج صاحب نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ ''سرسری جائزہ سے نظیریں قابل توجہ لگتی ہیں مگر اس کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی ہے۔ آپ یہ کتاب لنچ کے بعد مجھ سے میرے چیمبر میں مل کر حاصل کرلیں۔''

لنچ کے خاتمہ پر جب وکیل صفائی نے جج صاحب سے چیمبر میں ملاقات کی تو جج صاحب نے فرمایا۔ یہ تین نظیریں اتنے اہم مقدمہ کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اگر آپ اسی طرح کی دو نظیریں اور پیش کریں تو میں آپ کے موکل کو باعزت بری کرسکتا ہوں۔ وکیل صفائی نے کچھ دن کی مہلت چاہی اور اپنے موکل کو یہ خوش خبری سنائی۔ وکیل صفائی نے چند روز کے بعد دو نظیریں جج صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔

آج مقدمہ کا فیصلہ ہونا تھا جج صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''مقدمہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے نیز گواہوں کے بیان اور ان پر فریقین کے وکلاء کی جرح اور بحث کی روشنی میں عدالت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ قتل کا عینی شاہد نابالغ ہی نہیں کافی کم عمر بھی ہے جس کی گواہی قابلِ اعتماد نہیں۔ دوسرا کوئی عینی شاہد نہیں۔ مقتولہ کا کوئی نزاعی بیان بھی موجود نہیں۔ دوسرے گواہان بھی مجروح ہو چکے ہیں۔ لہٰذا انصاف کے

تقاضے کے تحت شک کا پورا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے اور اسے باعزت بری کیا جاتا ہے۔''

جج صاحب فیصلہ سنا کر چلے گئے۔ وکیل صفائی اپنی شان میں خود قصیدہ پڑھ رہا تھا لوگ خوش ہو کر عدالت میں ہی رقص کرنے لگے۔

کہانی ختم کر کے حضرت ابلیس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ابھی قہقہہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ میری چھوٹی بیٹی کی آواز میرے کان سے ٹکرائی۔

پاپا جلدی اٹھئے مجھے اسکول کی دیر ہو رہی ہے''

بیٹی کی آواز پر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور لاحول پڑھتا ہوا سوچنے لگا۔ آخر یہ کیسا خواب تھا؟

☆☆☆

زوال یا کمال

اوراس ایک لمحہ کو یاد کر کے اس کے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔وہ سوچنے لگی کیا ہوتا؟ دنیش میرے ساتھ کیا برتاؤ کرتے؟ میں کہاں جاتی؟ کہاں ملتی منھ چھپانے کی جگہ؟ کوئی کنواں، تالاب، نہر یا زہر؟ لیکن.......................................

زوال یا کمال

سروپ کماری جب گاؤں کے اسپتال سے اپنی بھابی کے ساتھ باہر نکلی تو اس کا انداز فاتحانہ تھا وہ اپنی اسکیم کی کامیابی کے نشے میں اس قدر مست تھی کہ اسے اس بات کا احساس بھی باقی نہ رہا کہ اس کے ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ کے، لوگ کیا معنی نکال رہے ہیں۔ اس کی بھابی کو اس کے اس رویہ پر حیرت ہو رہی تھی مگر وہ مجبوراً خاموشی اختیار کئے رہی۔

گھر پہنچتے ہی بھابی نے سروپ کماری کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔

تو بھی عجب پگلی ہے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کی ہدایت کی اور تو راستے بھر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی رہی۔ کون سا قلعہ فتح کرلیا کہ جوش میں ہوش نہیں۔ اگر کچھ گڑ بڑ ہوگئی تو سر پکڑ کر قسمت کو کوسنا۔ چلو اب بستر پر ۲۴ گھنٹے مکمل آرام کرو ورنہ تم جانو اور تمہارا کام۔ میں ذمہ دار نہیں۔

سروپ کماری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ بغیر کوئی جواب دئے بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کے ذہن پر کامیابی کا نشہ سوار تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر اس کی یہ اسکیم کامیاب نہ ہوتی تو...... اور اس ایک لمحہ کو یاد کر کے اس کے بدن میں خوف کی ایک لہر پھر دوڑ گئی۔ وہ سوچنے

لگی۔ کیا ہوتا؟ رمیش میرے ساتھ کیا برتاؤ کرتے؟ میں کہاں جاتی؟ کہاں ملتی منھ چھپانے کی جگہ؟ کوئی کنواں تالاب، نہر یا زہر؟ لیکن...... اب کوئی ڈر نہیں۔ یہ خیال آتے ہی سروپ کماری کو تمام واقعات یاد آنے لگے۔

لگ بھگ تین سال قبل میری شادی رمیش کے ساتھ ہوئی تھی۔ رمیش شہر کے ایک اسکول میں ماسٹر تھے۔ وہ شہر میں رہتے اور میں گاؤں میں اپنی ساس کے ساتھ رہتی تھی۔ زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی رمیش ہر سنیچر کی شام گاؤں آتے اور دوشنبہ کی صبح شہر واپس چلے جاتے۔ جب تک گھر پر رہتے میرا ہر طرح خیال رکھتے اور اپنی آمدنی کے لحاظ سے وہ میری ہر خواہش پوری کرتے مگر وہ دوسروں کی طرح رنگین مزاج نہ تھے بلکہ وہ بہت ہی سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے اور کم سخن بھی، بس ضرورت بھر ہی بات کرتے۔ اسی لئے ان کا صرف ایک ہی دوست تھا اور وہ بھی گھر کے سامنے رہنے والے یادو جی کا بیٹا شیتل۔ جو کہ ان کی ہی عمر کا تھا۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ ہمارے یہاں ایک خوبصورت بیٹی نے جنم لیا۔ میری ساس کو پوتے کی تمنا تھی وہ کچھ مایوس ہوئیں مگر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ رمیش نے پوری طرح میری دلجوئی کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ زمانہ بدل گیا ہے اب لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں ہماری بیٹی ششما ہمارے لئے بیٹا ہے۔ میں اس کی پرورش اس طرح کروں گا کہ یہی میرے گھرانے کا نام روشن کرے گی۔ مجھے زیادہ بچوں کی تمنا نہیں بس یہی ایک بیٹی کافی ہے ان کی اس بات سے مجھے بہت تسکین ہوئی۔

کچھ عرصے تک حالات نارمل رہے پھر مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ رمیش کی توجہ مجھ پر کم ہو رہی ہے کیونکہ اب ان کے معمولات میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اب وہ کئی کئی ہفتے گھر نہ آتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ زیادہ وقت گذرنے پر میری ساس خود شہر جا کر حال چال معلوم کر آتیں۔ گرمی کی ایک دوپہر تھی ہر طرف سناٹے کا عالم تھا۔ ساس شہر جا چکی

تھیں۔ششما سو رہی تھی۔ مجھے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکلی اور باہر کا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی کہ شاید باہر کی ہوا سے راحت ملے مگر دروازہ کھولتے ہی میرے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ سامنے والے گھر کے آنگن میں شیتل نہا رہا تھا۔ شیتل کا یہ روپ میرے لئے نیا تھا۔ اس کے کسرتی بدن کا ہر انگ اس وقت پوری طرح نمایاں تھا۔ وہ اس وقت ایک گبرو جوان نظر آ رہا تھا۔ میں اسے ایک ٹک دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کاش رمیش ایسے ہوتے۔ شیتل کی نظر جب مجھ پر پڑی تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور وہیں کھڑی رہی۔ نہانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور باہر نکل کر میرے گھر کے دروازہ کے قریب آیا تو میں پیچھے ہٹ گئی۔ شیتل بھی اندر آ گیا اور مسکرا کر بولا۔ کیا بات ہے بھوجی؟ کچھ نہیں گرمی لگ رہی ہے۔ میں جواب دیا۔

کچھ تو ہے آج کل آپ اداس رہتی ہیں۔ وہ پہلے والی چنچلتا نہیں؟ کہیں رمیش بھیا سے جھگڑا تو نہیں کر لیا؟ شیتل نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔ اگر میری اداسی کی وجہ جاننا چاہتے ہو تو رات میں آؤ۔ ساس شہر گئی ہیں۔ وہ کل لوٹیں گی۔ اس وقت تم اپنا کام کرو۔

اچھا آؤں گا کہتے ہوئے شیتل چلا گیا۔

رات دھیرے دھیرے گذر رہی تھی۔ میں تصورات کی دنیا میں کھوئی تھی کہ اچانک شیتل کی مدھم آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شیتل میرے بستر کے قریب کھڑا تھا۔ میں اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی شیتل کو میں نے اپنے پاس تخت پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ تم میری اداسی کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو؟ کیا تم میری اداسی دور کر سکتے ہو؟ ہاں میں تمہاری اداسی دور کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ شیتل نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے جوش میں اپنا ہاتھ میری پیٹھ پر رکھ دیا۔

میرے پورے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اچھے تو تم بھی مجھ کو لگتے ہو۔ میری بات سن کر شیتل نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ اگر اجازت

ملے تو میں آج تمھاری اداسی دور کردوں ۔ میں ہنس پڑی اس کے اتاؤلے پن پر۔اور پھر...... اس اندھیری رات میں ایک ایسا طوفان آیا جس میں اعتماد، وفا شعاری اور شوہر پرستی سب فنا ہو گئیں ۔ جب طوفان تھما تو برباد ہونے والی اور برباد کرنے والے میں سے کسی کو ندامت نہ تھی بلکہ دونوں مطمئن اور مسرور تھے ۔ وقفہ وقفہ سے یہ طوفان برابر آتے رہے۔آخر کار طوفان نے اپنا رنگ دکھایا تو میں نے شیتل کو اس کی خبر دی۔خبر سن کر وہ ایک دم گھبرا گیا۔مگر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔گھبراؤ نہ...... تم نے اپنا کام کیا اب میرا کمال دیکھنا۔

دو ہفتہ بعد جب رمیش گھر آئے تو میں نے موقع ملتے ہی ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کا اظہار کیا تو رمیش نے کہا۔کیا بات ہے۔بہت خوش نظر آ رہی ہو؟

ہاں بات ہی خوشی کی ہے میں پھر ماں......

کیا بکواس کرتی ہو میرے ادھورے جملے پر ہی وہ تقریباً چیختے ہوئے بولے۔''سچ سچ بتاؤ کس کا پاپ پال رہی ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں کہ میں نے کہا تھا اب مجھے اولاد نہیں چاہیے۔میں نے تو سشما کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ہی آپریشن کرا لیا تھا۔''

رمیش بول رہے تھے اور میرے پیر کے نیچے سے زمین کھسک رہی تھی مگر......اچانک دماغ میں ایک جھناکا ہوا اور میں نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔''آخر میری چال کامیاب ہو گئی۔''

''کیسی چال'' رمیش نے پوچھا۔

میں نے رمیش کو نارمل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔اصل بات یہ ہے کہ کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ آپ میری طرف سے توجہ ہٹائے ہیں۔اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی کہ شاید بیٹی کی پیدائش سے یہ مایوسی ابھری ہے۔اس لئے آپ کی مایوسی ختم کرنے کے لئے ایسی خبر سنانا چاہی جس سے آپ میری طرف ملتفت ہوں۔میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی آپ نے اپنا راز بھی ظاہر کر دیا اور میرا وہم بھی دور ہو گیا۔''

رمیش نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ہاں یہ میری غلطی تھی مجھے یہ بات تمھیں پہلے بتا دینا چاہیے تھا مگر......

مگر...... وگر کچھ نہیں۔ یہ تو بس ایک چال تھی اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔اب مجھے بھی کوئی شکایت نہیں۔میں نے رمیش کے ذہن کو صاف کرنے کے لئے کہا۔

رمیش مطمئن ہو گئے اور دوسرے دن حسب معمول وہ شہر چلے گئے ان کے شہر جانے کے بعد میں نے اپنی ساس سے اجازت لی اور اپنی بھابی کے گاؤں چلی آئی۔بغیر کسی اطلاع کے پہنچنے پر بھابی نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے سروپ یہ اچانک کیسے آ گئی۔''

بس آ گئی۔بغیر کام کہاں فرصت آنے کی بھابھی۔میں نے جواب دیا۔

''اچھا بیٹھو'' بھابی نے کہا۔

میں نے بیٹھتے ہی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔بھابی دراصل ایک ضروری کام آن پڑا ہے اس لئے آنا پڑا۔معاملہ یہ ہے کہ رمیش ابھی دوسرا بچہ نہیں چاہتے اس لئے وہ چاہ رہے ہیں کہ میں صفائی کرا لوں۔وہ شہر لے جانا چاہ رہے تھے مگر میں نہ گئی میں نے سوچا وہاں پریشانی ہوگی۔یہاں پر آپ نرس ہیں تو کام آسانی سے ہو جائے گا۔میرا یہ کام جلدی کرا دو ابھی صرف دو ہفتوں کا معاملہ ہے۔

بھابی مجھے لے کر اسپتال گئیں اور انھوں نے صرف میری صفائی ہی نہیں کرائی بلکہ ایسا انتظام بھی کرا دیا کہ جب تک نہ چاہوں بچہ نہ ہو۔میری چال ہر جگہ کامیاب رہی اور اب تو شیتل سے ملن کی راہ کا یہ روڑا بھی ہٹ گیا...... مجھ پر دوا کا اثر ہوتا رہا۔میری آنکھوں میں خمار چھانے لگا اور کب میں نیند کی آغوش میں چلی گئی پتہ ہی نہ چلا۔

مگر...... نیند میں بھی سروپ کماری کے ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ ٹھوکر لگنے کے بعد بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی ہے اور شاید کبھی نہ کھل سکے کیونکہ وہ اس حادثے کو زوال نہ مان کر اپنا کمال مان رہی تھی۔

☆☆☆
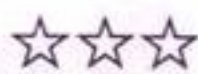
مسیحا

وہ مجھے اپنے جسم کا پورا جغرافیہ دکھانا چاہ رہی ہے جس میں اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان کھائی اور پھر اس کے نیچے کا میدانی علاقہ جو کافی سڈول تھا وہ جس طرح میرے ہاتھ کو پکڑے تھی اس سے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میدانی علاقے کے بعد کا نشیبی علاقہ بھی دکھانے کے لئے بے چین ہے۔

مسیحا

وہ دسمبر کی ایک سرد شام تھی ۔ میں اپنے کلینک پر موجود مریضوں کو دیکھنے کے بعد آرام کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ دو خواتین کلینک میں داخل ہوئیں اور آ کر میری میز کے قریب بیٹھ گئیں۔

''کہئے کیا بات ہے'' میں نے پوچھا

''یہ میری بہو ہے۔'' معمر خاتون نے دوسری خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اس کے سینے میں درد رہتا ہے کئی جگہ دکھایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

میں نے اس جوان خاتون سے اس کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ اکثر میرے سینے میں بائیں طرف میٹھا میٹھا درد رہتا ہے یہ کافی دن سے ہے پہلے تو میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی مگر اب اس میں شدت ہو گئی ہے اکثر یہ درد شام کو ہی اٹھتا ہے اور رات گئے اس میں شدت بڑھ جاتی ہے۔

''کیا یہ درد کسی خاص موسم میں ہوتا ہے؟ کیا کبھی پہلے بھی یہ درد اٹھتا تھا؟ میں نے پوچھا۔

''ہاں سردی کے موسم میں کچھ زیادہ ہوتا ہے۔'' مریضہ نے جواب دیا۔

''کبھی کوئی چوٹ تو نہیں لگی تھی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں۔ مجھے ایسا کوئی حادثہ یاد نہیں۔'' مریضہ نے کہا۔

میں نے اس سے ہاتھ بڑھانے کو کہا اور اس کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھ کر نبض دیکھنے لگا۔ اس کی نبض معمول کے مطابق تھی لیکن اس کی ایک حرکت نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

جب میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا ہاتھ میری ران پر رکھ کر پورا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا۔ اس وقت اس کی سانسوں کی رفتار کافی بڑھ گئی تھی۔ کچھ اور حالات معلوم کر میں نے اسے دوا دے دی۔ دوا لے کر وہ دونوں کلینک سے باہر چلی گئیں۔ لیکن مریضہ کی اس حرکت نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی۔ میں کوئی بہت زیادہ مذہبی نہیں مگر میں نے اپنا یہ اصول بنا رکھا ہے کہ خواتین کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا ہوں۔ اکثر اوقات صرف حال سن کر دوا دے دیتا ہوں یہ خدا کی مہربانی اور فضل ہے کہ اس نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے اس طرح ایک نیک نام ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ میں نے اپنی ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران ہی ایک حکیم صاحب کے ساتھ مطب پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح نبض شناسی میں بھی دسترس حاصل کر لی تھی لہٰذا اگر کبھی ایسا ہوتا کہ حال سن کر دوا دینے سے افاقہ نہ ہوا تو مریضہ کی نبض دیکھ کر دواؤں کا انتخاب کرتا ہوں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مریضہ کے جسم کے کسی حصہ کو چھو کر دیکھوں ایسی ہی کوئی مجبوری ہو تو بات دوسری ہے مگر آج مریضہ کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر ایسا کیوں؟ میں اس مسئلے پر شاید کافی دیر الجھا رہتا مگر دوسرے مریض کے آنے سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

دوسرے دن شام کو پھر دونوں خواتین آئیں۔ میں نے حال پوچھا تو مریضہ نے کہا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

چند روز دوا کھائیے فائدہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا۔ اور پھر وہی دوا دے دی۔ چار دن

لگا تار دوا دینے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے کہا ''آپ ایکسرے کرالیں تا کہ اس کی رپورٹ دیکھ کرکوئی دوا تجویز کی جائے۔''

میری اس بات کو سن کر مریضہ نے کہا۔ڈاکٹر صاحب درد میرے سینے میں ہے اور آپ نے صرف نبض دیکھ کر ہی دوا دے دی۔ برائے مہربانی آپ میرے اس حصہ کا معائنہ تو کر ہی لیں۔شاید کچھ بات بن جائے۔اگر دوا مہنگی بھی ہو تو کوئی فرق نہیں۔ہوسکتا ہے سستی دوا کام نہ کر رہی ہو۔ورنہ ایکسرے تو کرا ہی لیا جائے گا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے ایکسرے رپورٹ آنے پر ضروری نہیں کہ مہنگی دوا ہی لکھنا پڑے بعض اوقات سستی دوا بھی کافی سودمند ثابت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

لیکن اگر آپ جانچ کرلیں تو بہتر ہوگا۔'' وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

میں نے مریضہ کی تسلی کے لئے اس سے کہا اچھا چلئے میں دیکھ لیتا ہوں۔اسے لے کر میں برابر والے پارٹیشن میں چلا گیا۔وہاں پہنچ کر وہ اس تیزی کے ساتھ میز پر دراز ہوگئی کہ میں حیرت میں پڑ گیا۔جس مریضہ کو چلنے میں تکلف تھا وہ چستی و پھرتی کی مورت کیسے بن گئی؟

میں نے پوچھا۔'' درد کہاں پر ہوتا ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دل کے مقام پر رکھتے ہوئے کہا ''یہاں'' مگر یہ دھیرے دھیرے نیچے کو بڑھتا ہے اور یہاں تک آجاتا ہے اس نے میرے ہاتھ کو اپنی آواز کے ساتھ کھسکاتے ہوئے اپنی ناف تک پہنچا دیا۔

میں نے پوچھا ''یہ درد کس طرح کا ہوتا ہے۔'' جواب میں اس نے کہا جیسے چیونٹی رینگ رہیں ہوں اکثر مجھے شبہ ہوتا ہے کہ واقعی چیونٹی رینگ رہی ہیں اور میں ان کو تلاش کرنے لگتی ہوں یہ کہتے ہوئے اس نے جمپر ہٹا کر ان نشانات کو دکھایا جو چیونٹی پکڑنے کی کوشش میں اس کے ناخن سے جسم پر پڑ گئے تھے۔مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مریضہ نفسیاتی مریض ہے اور

ذہنی انتشار کی شکار بھی ہے وہ مجھے اپنے جسم کا پورا جغرافیہ دکھانا چاہ رہی ہے جس میں اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان گھاٹی اور پھر اس کے نیچے کا میدانی علاقہ جو کافی سڈول تھا وہ جس طرح میرے ہاتھ کو پکڑے تھی اس سے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میدانی علاقے کے بعد کا نشیبی علاقہ بھی دکھانے کے لئے بے چین ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ آزاد کرایا اور اس سے باہر چلنے کو کہا تو وہ بولی۔ آپ نے تو ٹھیک سے توجہ ہی نہ دی۔

''نہیں میں نے پوری طرح دیکھ اور سمجھ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

مریضہ کی اس کیفیت کے مدِ نظر میں نے اسے ذہنی سکون اور نیند کی دوا دے کر کہا کہ آپ ایکسرے ضرور کرالیں تاکہ مرض کا صحیح علم ہو سکے اور اس کے مطابق علاج ہو سکے دوا لے کر وہ انتہائی نڈھال سی کلینک سے نکل گئی۔ میری زندگی میں یہ پہلی مریضہ تھی جس کی حرکات وسکنات نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ مریضہ سے اس کی زندگی کے حالات معلوم کئے جائیں تو شاید اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکے۔

دو دن بعد وہ ایکسرے لے کر آئیں۔ ایکسرے رپورٹ بالکل نارمل تھی میں نے اس کو بتایا کہ ایکسرے رپورٹ کے مطابق آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے اور یہ کہ بیماری آپ کی ذہنی اپج ہے۔

ڈاکٹر صاحب! جو مجھ پر گذرتی ہے وہ آپ نہیں جانتے بے جان مشین سے لیا گیا یہ فوٹو بھلے ہی مجھے نارمل بتائے مگر میں نارمل نہیں ہوں۔ اس کی یہ بات سن کر پھر مجھے حیرت ہوئی اور فوری طور پر میں نے ایک فیصلہ لیتے ہوئے کہا۔

آپ کل شام میں تشریف لائیں تو اطمینان سے آپ سے بات کروں گا۔ کل کلینک بند رہنے کا دن ہے میں اوپر ہی رہتا ہوں آپ اوپر ہی آجایئے گا لیکن شام چھ بجے تک ضرور آجایئے گا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر چمک آگئی۔

دوسرے دن وہ ٹھیک چھ بجے حاضر تھی لیکن آج ساتھ میں معمر خاتون کے بجائے لگ بھگ گیارہ سال کی ایک بچی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کا تعارف اپنی اہلیہ سے کرایا پھر ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اس سے کہا۔

ہاں! اب تم اپنی کہانی سناؤ۔ مگر تفصیل سے اور بغیر کچھ چھپائے تاکہ اسی کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جاسکے۔ میری بات سن کر اس نے کہنا شروع کیا۔

میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے والد ماسٹر تھے میرے والد نے مجھے گھر پر ہی تعلیم دی اور والدہ نے زندگی گذارنے کے ہنر سکھائے اس طرح میں امورِ خانہ داری میں بھی ماہر ہوگئی۔ دو سال قبل والدین نے میری شادی کردی۔ میری ساس کو تو آپ نے دیکھا ہی ہے یہ میری خالہ ہیں۔ لیکن ان کا خاندان کافی عرصہ قبل ہی اس شہر میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ میری خالہ کی صرف ایک ہی اولاد ہوئی جو آج میرے شوہر ہیں۔ میری شادی سے پانچ سال پہلے سے وہ کویت میں تھے وہاں ایک فرم میں نوکر تھے اس لئے ان کے گھر میں دولت کی کمی نہ تھی۔ دو سال قبل وہ دو ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے تو خالہ نے ان کی شادی کرنی چاہی اور قرعہ میرے نام نکلا۔ میرے والدین نے بھی اس رشتہ کو میرے حق میں اچھا سمجھا۔ اس طرح میری شادی ہوگئی۔ جب میری شادی ہوئی اس کے دس دن بعد میرے شوہر کو واپس جانا تھا۔ میں اپنی سسرال آگئی۔ میرے شوہر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کویت جاکر بہت جلد میرے لئے ویزا حاصل کر کے مجھے اپنے پاس کویت بلالیں گے۔ میرے پاسپورٹ کے لئے فارم بھی جمع کرادیا گیا۔ ان دس دنوں میں میرے شوہر نے مجھے زندگی کی ان نئی حقیقتوں سے واقف کرادیا جس سے میں نابلد تو نہیں تھی مگر تجربہ نہ تھا جواب ہوا تھا۔ یہ دس دن پر لگا کر اڑ گئے اور جدائی کی گھڑی آگئی۔ میں نے نم آنکھوں سے انھیں رخصت کیا اور دل کو یہ کہہ کر سمجھالیا کہ کچھ مہینوں کی ہی تو بات ہے۔ سسرال اور مائکہ

کے درمیان میرے دن آرام سے گذرتے رہے۔ جاگنا توٹی۔ وی دیکھنا یا وی۔ سی آر پر فلمیں دیکھنا اور سونا تو سنہرے خواب دیکھنا ایک معمول بن گیا تھا۔ کبھی دیکھتی کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ ہوائی جہاز سے اڑ کر کویت پہنچ گئی ہوں۔ شاندار فلیٹ ہے اور ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں، زندگی کی ساری راحتیں موجود ہیں۔ چھ ماہ تک تو یہ سلسلہ چلتا رہا مگر اس کے بعد دل بے چین ہونے لگا۔ کیونکہ شوہر کے خط میں میرے ویزے کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اب تو خطوں میں وہ چاہت کی خوشبو نہ محسوس ہوتی جو انہوں نے یہاں رہ کر دکھائی تھی۔ دھیرے دھیرے میرے دل میں شک کی لہر اٹھنے لگی اس شک کو تقویت ان ٹیلی ویژن اور فلموں کی کہانیوں سے ملی جن میں بیوی کے ہوتے ہوئے بھی شوہروں کو دوسری عورتوں سے تعلقات رکھتے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ دوسری طرف اب خط کافی دیر سے آتے اور مختصر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد جس جسمانی لذت سے میں آشنا ہوئی تھی اس جسمانی لذت کو حاصل کرنے کی خواہش نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس بھوک نے پوری شدت سے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ دن تو کسی طور پر کٹ جاتا تھا مگر رات میں بستر کانٹوں کی سیج بن جاتا۔ میں یہ سوچتی کہ کیا میرے شوہر کو یہ بھوک نہ ستاتی ہوگی۔ اگر ہاں تو وہ کیسے برداشت کر رہے ہوں گے۔ وہ مرد ہیں ان کے پاس اس کے تدارک کا راستہ ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے بدن میں آگ سی بھر جاتی اور درد سا محسوس ہونے لگتا۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ اگر نیند آجاتی تو ڈراؤنے خواب مجھے چونک کر جاگنے پر مجبور کر دیتے۔ رات میری جسمانی بھوک کو اور بڑھا دیتی۔ اب یہ حال ہے کہ کسی طور اور کسی وقت چین نہیں ملتا۔ حالانکہ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں مگر یہ درد آہستہ آہستہ روگ کی شکل اختیار کر گیا اور میں ڈاکٹروں کے پاس علاج کے لئے چکر لگانے لگی۔ اس نے اپنی بات ختم کر ایک

لمبی سانس لی۔

''کیا مجھ سے پہلے آپ نے جن ڈاکٹروں سے علاج کیا ان کے ساتھ بھی وہی رویہ اپنایا جو آپ نے میرے ساتھ اپنایا،، میں نے سوال کیا۔

نہیں! کیونکہ اب تک جن ڈاکٹروں سے رابطہ رہا وہ سب دوسرے مذاہب کے تھے۔ان کے ساتھ ایسی حرکت کر کے میں مسلم خاتون کو بدنام نہیں کرنا چاہتی تھی۔مگر جب آپ کو دیکھا تو میرے دل نے کہا یہ ہم مذہب ہے جوان ہے۔اگر میرا شوہر وہاں پر دادِعیش دے رہا ہے تو کیوں نہ میں بھی اپنے درد کا مداوا آپ سے کرلوں۔ڈاکٹر ہونے کے ناتے آپ مجھے آنے والے خطرات سے بھی بچا سکتے ہیں۔اس لئے میں نے یہ حرکت کی تاکہ علاج کے بہانے آپ کے قریب آسکوں۔دنیا کو کوئی شک بھی نہ ہو دوا اثر کرے نہ کرے درد تو مٹ جائے گا۔پژمردہ چہرے پر شگفتگی آجائے گی جسے دنیا دوا کا اثر سمجھے گی مگر حقیقت کا علم مجھے ہوگا کہ دوا نہیں بلکہ ڈاکٹر کے عمل کا کرشمہ ہے۔مجھے یہ علم نہ تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں۔اتنا کہہ کر وہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

اس کے رونے کی آواز سن کر میری اہلیہ آگئیں۔اہلیہ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا میں اپنے درد کی کہانی سنا رہی تھی اس لئے آنسو نکل پڑے۔پوری کہانی سن کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ابھی اس عورت میں اسلامی غیرت زندہ ہے اس لئے میں نے کہا۔

میں آپ کو ایک مشورہ دے رہا ہوں۔اسے غور سے سنئے۔مجھے امید ہے کہ اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا تو یہ دوا سے زیادہ کارگر ثابت ہوگا۔یہ دنیا بڑی ظالم ہے سچائی کی راہ پر چلنے والوں کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے مگر برائی کی راہ پر چلنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان کا پلان کامیاب ہوتا ہے اور انسان تباہی کے ایسے غار میں گر جاتا ہے جہاں کوئی مدد کرنے والا نہیں ملتا۔اگر میں چاہتا تو آپ کو غلط راہ پر ڈال دیتا

اور آپ کو برائی کی اس راہ پر لگا دیتا جس پر آپ چلنے کو مجبور تھیں۔ میں مسلمان ہوں میں کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اسے غلط راہ پر لگانا نہیں چاہتا۔ نہ امانت میں خیانت کرنا چاہتا ہوں اور نہ کسی کو خیانت کا درس دینا چاہتا ہوں۔ آپ کے درد کا یہ علاج نہیں ہے آپ ایک مسلم خاتون ہیں آپ کا اپنے شوہر کے سلسلے میں اس طور پر سوچنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بغیر ثبوت کے صرف شک کی بنیاد پر الزام لگانا مومن کی شان نہیں۔ آپ سب سے پہلے ٹیلی ویژن اور وی۔ سی۔ آر سے نجات حاصل کریں۔ خالی اووقات میں امہات المومنین اور صحابیات کی پاکیزہ سیرت کا مطالعہ کریں۔ جس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس طرح اپنی زندگی گذاری۔ اس سے آپ کو برائی کے خلاف لڑنے کا حوصلہ ملے گا۔ باقی وقت میں محلے کی بچیوں کو تعلیم دیں۔ آپ کی ان مصروفیات میں اتنا وقت ہی نہ بچے گا کہ شیطان آپ پر حملہ کر سکے۔ اس طرح آپ میں مومنانہ جذبہ ابھرے گا۔ رہا رات کا مسئلہ تو آپ رات کی تنہائی میں مالک کل کائنات کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے دردِ دل کو بیان کریں۔ وہ سب سے زیادہ سننے والا ہے وہ مسبب الاسباب ہے وہ قاضی الحاجات ہے وہ رحیم ہے۔ یقیناً وہ آپ کی فریاد کو سن کر آپ کے حق میں ایسے اسباب پیدا کر دے گا جو آپ کے دردِ دل کو سکونِ دائمی میں تبدیل کر دے گا۔ میں آپ کو چند دوائیں لکھے دے رہا ہوں جو آپ بازار سے خرید لیں اور اسے استعمال کریں جس سے آپ کو ذہنی سکون ملے گا اور میرے مشورے پر عمل کرنے سے روحانی سکون ملے گا۔ جو ہر انتشار پر غالب آجائے گا۔ اگر آپ کو میرا مشورہ قبول ہے تو میرے گھر کا دروازہ ہمیشہ آپ کے لئے کھلا رہے گا۔ یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے اور اگر آپ کو میرا مشورہ قبول نہیں تو میں آپ سے صرف اتنا کہوں گا کہ آئندہ پھر اس طرف کا رخ نہ کیجئے گا۔ میں اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ آخر سکوت ٹوٹا وہ کہہ رہی تھی۔ بھائی جان آپ نے مجھے ایک نئی روشنی دی ہے آپ نے مجھے جوش میں ہوش گنوا کے زندگی برباد کرنے سے روک کر

مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی ضرور کروں گی بھائی جان یہ ایک بہن کا اپنے بھائی سے وعدہ ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر سکون کا نور چمک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اجازت لی اور گھر کے لئے روانہ ہوگئی میں اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

آج بھی جب مجھے اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو اپنے مالک حقیقی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے شیطان کے حملے سے محفوظ رکھا۔ اور میں اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ مگر...... اکثر جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میرے ذہن میں بار بار یہ سوال نشتر کی طرح چبھتا ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ کر مادی ترقی کے حصول کے لئے غیر ممالک میں پڑے رہتے ہیں۔ کیا انھیں علم ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں شیطان ان کے گھروں میں کیا گل کھلا رہا ہے؟ سوال آج بھی برقرار ہے۔ مگر جواب دینے والا کوئی نہیں۔

آرزو

مجھے اب لڑکیوں کے ٹیوشن میں لطف نہ ملتا تھا بلکہ لڑکوں کے ٹیوشن میں زیادہ دلچسپی تھی۔ میں ان لڑکوں کے ساتھ بوائے فرینڈس جیسے تعلقات بنا رہی تھی۔ ٹیوشن کے وقت ان پر پوری توجہ دیتی اکثر ان کو آؤٹنگ کے لئے بھی لے جاتی۔اس طرح مردوں کے ساتھ رہتے رہتے مجھے بہت سے تجربے ہوتے اور مردوں کی کمزوریوں کا علم ہوا۔

آرزو

''نہیں۔نہیں۔نہیں۔مجھے کسی سے نہیں ملنا۔نہیں چاہئے مجھے کسی کی ہمدردی۔میں اپنے گناہوں کا کفارہ خود ادا کروں گی۔تنہا اور صرف تنہا۔نہیں مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔'' ملزمہ آرزو کا یکا یک اس طرح پھٹ پڑنا میری سمجھ سے باہر تھا۔کیونکہ دن کی روشنی میں شہر کے ایک رہائشی علاقہ میں رونما ہونے والے اس سفاکانہ اور ظالمانہ واقعے، جس میں ایک انسان نما وحشی نے گھر کے اندر پانچ افراد جن میں دو خاتون اور تین بچیاں شامل تھیں، چاقو سے گود ڈالا تھا، جن میں ایک خاتون نے موقع پر دم توڑ دیا تھا۔'' کے سلسلے میں آرزو بیگم گرفتار ہو کر آئی تھی۔ ہر وقت خاموش رہنے اور بہت کم کسی سے بات کرنے والی آرزو بیگم کا آج جیل کے اس ملازم پر اس طرح برس پڑنا باعثِ حیرت تھا جس نے صرف اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی کہ کوئی ان سے ملاقات کے لئے آیا ہے۔میں نے فوراً آرزو بیگم کو روکا اور سمجھا کر ملاقاتی سے ملنے کو راضی کیا۔

اس واقعہ نے مجھے آرزو بیگم میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔کیونکہ میں ان کی سنجیدگی اور نرم لہجہ سے متاثر تھی مگر آج کے واقعے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔موقعہ ملتے ہی میں نے آرزو بیگم سے اس تضاد کی وضاحت چاہی۔میرا سوال سن کر وہ دور خلاؤں میں تکنے لگیں۔

''کہاں کھو گئیں''۔ میں نے پوچھا

''کہیں نہیں۔'' جواب ملا

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے کہا

''تمہارے سوال کا جواب بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گی۔ لیکن اس وقت نہیں بلکہ شب کی تنہائی میں تاکہ کوئی خلل نہ پڑے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

میں نے دن بہت بے چینی سے گذارا۔ شام ہوئی پھر رات آئی۔ میں آرزو بیگم کے پاس پہنچی اور یاددہانی کرائی۔

ہاں! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے میں تم کو اپنی کہانی سناتی ہوں جس میں تمہارے سوال کا جواب بھی ہے اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ اور اپنی کہانی شروع کی۔

میں ایک پسماندہ خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے والد راج گیر تھے میری ماں بھی ان پڑھ تھیں۔ ان کا مذہب صرف اور صرف خاوند کی خدمت تھا۔ دونوں بڑے قناعت پسند تھے ہر حال میں خوش رہتے روکھا سوکھا جو میسر آتا کھا کر خدا کا شکرادا کرتے۔ زبان پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ لاتے۔ ایک چھوٹا سا کرائے کا کمرہ ان کا مکان تھا۔ والدین کی شادی کے آٹھ برس بعد میری ولادت ہوئی تو والدین نے اپنی آرزو پوری ہونے کی خوشی میں میرا نام ''آرزو'' رکھا۔ پانچ سال کی عمر میں مجھے قریب کے ایک اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ میری والدہ کو اپنے ان پڑھ ہونے کا بہت احساس تھا اس لئے انہوں نے میری تعلیم پر پوری توجہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ چونکہ میں برابر پاس ہوتی رہتی تھی اس لئے میری ہر خواہش کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ پانچواں درجہ پاس کرنے کے بعد مجھے نیا حوصلہ ملا۔ والدین کا سر بھی فخر سے اونچا ہو گیا۔ میں نے پوری توجہ کے ساتھ پڑھائی جاری رکھی۔ ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مجھے والدین کی مجبوری کا پورا

احساس ہونے لگا تھا۔اس لئے ان سے فرمائش کرنے میں شرم محسوس کرنے لگی تھی مگر مجھے
یہ بھی اچھا نہ لگتا تھا کہ میں اپنی سہیلیوں سے کم رہوں۔اس لئے میں نے ٹیوشن کرنا شروع
کیا۔اسطرح میں اپنے اخراجات اور اپنے فیشن کے لئے خود کفیل ہو چکی تھی۔اس کے
باوجود اکثر میری والدہ مجھے سمجھاتیں کہ زمانہ خراب ہے اتنی آزادی اور فیشن اچھا نہیں۔فیشن
گھر کی چہار دیواری تک تو مناسب ہے مگر جب یہ بر سر عام ہوتا ہے تو مصیبت بن جاتا
ہے۔عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میری ضرورتیں بھی بڑھنے لگیں۔مجھے اپنی جسمانی تبدیلیوں
کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔میں جدھر سے گذرتی لوگوں کی نگاہیں میرا تعاقب
کرتیں۔میں دل ہی دل میں خوش ہوتی اور خود کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے اور سجانے
کا جتن کرتی۔اس کے لئے مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔میں نے کوشش
کر کے ٹیوشن بڑھائے اور ہائی اسکول تک کے لڑکوں کو ٹیوشن دینا شروع کیا۔مجھے ان لڑکوں
کے گھر جانا پڑتا تھا کیونکہ میرا اپنا گھر اس لائق نہ تھا کہ میں گھر پر ان کو بلا سکتی۔اپنے گھر کی
خراب حالت کی وجہ سے میں اپنی سہیلیوں کو بھی اپنے گھر نہ بلاتی تھی ان سے ملاقات کے
لئے میرے پاس ہوٹل کے علاوہ کوئی جگہ نہ تھی۔میری سہیلیوں کے ساتھ اکثر ان کے
بوائے فرینڈس بھی ہوتے تھے جن سے ملاقات ہوتی تھی۔میری سہیلیاں جب اپنے
بوائے فرینڈس کے قصے سناتیں تو میری بھی یہ تمنا ہوتی کاش میرا بھی کوئی بوائے فرینڈ
ہوتا۔میں بھی اس کے ساتھ موج اڑاتی۔یونیورسٹی میں داخلے کے بعد میں نے اپنے کو بدلنا
شروع کر دیا تھا۔مجھے اپنے گھر کا ماحول، محلے کا ماحول برا لگنے لگا تھا۔میں اس میں تبدیلی
چاہتی تھی۔میں نے اپنے کو زیادہ سے زیادہ گھر اور محلے سے دور رکھنا شروع کر دیا
تھا۔یونیورسٹی سے بچا وقت سہیلیوں کے ساتھ اور پھر ٹیوشن کرنے میں لگاتی۔مجھے اب
لڑکیوں کے ٹیوشن میں لطف نہ ملتا تھا بلکہ لڑکوں کے ٹیوشن میں زیادہ دلچسپی تھی۔میں ان
لڑکوں کے ساتھ بوائے فرینڈس جیسے تعلقات بنا رہی تھی ٹیوشن کے وقت ان پر پوری توجہ

دیتی اور اکثر ان کو آؤٹنگ کے لئے بھی لے جاتی۔ اس طرح مردوں کے ساتھ رہتے رہتے مجھے بہت سے تجربے ہوئے اور مردوں کی کمزوریوں کا علم ہوا۔ میرے نفس نے مجھے بہکانا شروع کر دیا تھا۔ میں مردوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں لگ گئی۔ میں اپنے ماضی کو بالکل فراموش کرنے پر تلی تھی۔ اب میرے کئی بوائے فرینڈس بن گئے تھے ساتھ ہی جہاں جہاں ٹیوشن کرنے جاتی تھی ان گھروں میں بھی تعلقات بڑھا لئے تھے اس طرح گھر اب میرے لئے ایک سرائے تھا۔ دیر رات گئے جا کر سو رہتی اور علی الصبح نکل پڑتی۔ والدین کے پوچھنے پر اپنی چرب زبانی سے ان کو خاموش کر دیتی۔ میری اس چرب زبانی سے میری والدہ کبھی مطمئن نہ ہوتیں اور ہمیشہ اونچ نیچ سمجھاتی رہتیں جو میں سنی ان سنی کر دیتی کیونکہ جوانی دیوانی ہو رہی تھی۔ میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دن کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ہوٹل اور یونیورسٹی میں گذارتی، پھر ٹیوشن پڑھانے جاتی جہاں ناشتہ کے ساتھ آرام کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ رات پھر کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ کسی ہوٹل میں کھا پی کر گذارتی اور دیر رات گئے گھر آ کر سو جاتی۔ دو سال کی مدت میں والدین سے کشمکش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے بی۔ اے۔ پاس کرتے ہی گھر کو آخری سلام کیا اور ایک کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئی۔ گھر سے میں صرف اپنے کپڑے، کتابیں اور فیشن کا سامان اٹھا لائی تھی اور لاتی بھی کیا وہاں تھا ہی کیا؟ مجھے گھر، محلہ اور والدین کے چھوٹنے کا کوئی غم نہ تھا۔ کیونکہ یہ سب میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھے بلکہ میں خوش تھی کیونکہ اب میں اپنی دنیا کی مالک خود تھی۔

مردوں کی یہ کمزوری ہے کہ وہ عورتوں کا قرب چاہتے ہیں۔ اس کی نگہ کرم کے متمنی رہتے ہیں۔ ٹیوشن سے میری آمدنی تو تھی ہی عزت بھی ملتی تھی۔ میں اپنے شاگردوں کو ہمیشہ بوائے فرینڈس کا درجہ دیتی اور میرے نوجوان اور ناتجربہ کار شاگرد تو بہت آسانی سے میرے اشاروں پر ناچتے تھے کیونکہ اس میں ان کو کسی بدنامی کا ڈر بھی نہ ہوتا۔

اب میری یہ حالت تھی کہ میں نے اس کو اپنا بزنس بنا لیا تھا میرا یہ بزنس بہت وسیع اور

منافع بخش تھا۔ میں اس بزنس کی مالکِ کل تھی۔ اب تو یہ حال تھا صبح کسی کے ساتھ، دوپہر کسی کے ساتھ اور شام کسی کے ساتھ تو رات کسی کے ساتھ گذرتی۔ اس طرح بغیر کسی خرچ کے دن بھر کا خرچ تو پورا ہوتا ہی نذرانے اور تحائف الگ ملتے۔ سوٹ ساڑی، گھڑی اور دوسری چیزوں کی بھرمار تھی۔ میں اپنے برتھ ڈے وغیرہ پر جو پارٹیاں دیتی اس کا خرچ بھی کوئی نہ کوئی اٹھانے کو تیار ہو جاتا۔ اس طرح خرچ تو کوئی اور کرتا لیکن گفٹ آتے میری جھولی میں۔ وقت گذرتا رہا۔ میرا بزنس کامیابی سے چل رہا تھا۔ اچھی خاصی رقم میرے اکاؤنٹ میں تھی۔ کیونکہ میں اس بزنس میں ماہر ہو چکی تھی بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ میں ایک کامیاب ''کال گرل'' بن چکی تھی اور کامیاب اس لئے تھی کہ اس میں کسی دوسری عورت کی کسی طرح کی کوئی شرکت نہ تھی۔ اب میں نے صرف موٹی مرغیوں پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی اس لئے کم وقت میں زیادہ منافع ملنے لگا۔ میں ایک مشین بن چکی تھی مجھے کسی مرد سے انسیت تک نہ تھی مگر میں ایک کامیاب اداکارہ کی طرح اپنی بزنس میں ہر ایک پر یہ ظاہر کرتی کہ بس وہ ہی میرا منظور نظر ہے۔ عشق و محبت کو بکواس اور پاگل پن سمجھتی تھی اور اس بات پر فخر کرتی تھی کہ یہ بیماری مجھے چھو کر بھی نہیں گذری لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور وقت نے کروٹ لی میری زندگی میں سلیم نامی ایک نوجوان کیا آیا کہ میری حالت ہی بدل گئی۔ اس سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ محبت کیا ہے؟ اسے دیکھتے ہی میرا دل اچھلنے لگتا میں اس کی دیوانی ہوگئی اور میرا یہ حال ہوگیا کہ میں اس کے لئے کسی حد تک جانے کو تیار تھی۔ سلیم کی انارکلی بننے کے لئے میں اپنی ساری کمائی نچھاور کرنے کے لئے تیار تھی لیکن سلیم نے یہ گوارہ نہ کیا کیونکہ وہ بھی ایک خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ میں نے اس سے تعلقات کی ڈور مضبوط بنائے رکھنے اور گھر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس کی چھوٹی بہن کو پڑھانا

شروع کر دیا۔ سلیم کے دل میں میرے لئے کیا احساسات تھے مجھے اس کا علم نہ تھا مگر وہ مجھے بڑی خوبی کے ساتھ ایک عورت کی طرح برت رہا تھا۔ میں سلیم کو کھونا نہ چاہتی تھی جس کا صرف ایک راستہ تھا شادی۔ اس لئے میں نے سلیم سے ایک موقع پر اس کا ذکر کیا۔ میری اس تجویز کو سن کر سلیم نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کر اپنی شریکِ حیات بنانے کے لئے سوچ تک نہیں سکتا جو شادی سے پہلے اپنا جسم کسی کو سونپ دے۔ ایسی عورت سے وفا کی امید نہیں کی جا سکتی۔ تم نے میری ضرورت پوری کی اور میں نے اس کی پوری قیمت چکا دی۔ دوکاندار اور خریدار میں چاہے جتنے تعلقات ہوں مگر یہ تعلقات رشتہ داری میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ سلیم کا یہ جواب میرے دل کو پاش پاش کر گیا مگر میں نے اپنا ردِ عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ لیکن دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گی۔ دھیرے دھیرے میں اس سے دور ہوتی گئی اور یہ دوری میری آتشِ انتقام کو اور بڑھاتی رہی۔ خاص طور پر جب دوسرے مردوں کے ساتھ اس لطف سے محروم رہتی جو سلیم نے مجھے دیا تھا تو یہ محرومی انتقام کی آگ کو اور ہوا دیتی۔

عورت جب انتقام پر آتی ہے تو حد سے گزر جاتی ہے۔ مین نے بھی ایک ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جس کی فطرت میں شکی پن اور اجڈ پن ہو ساتھ ہی دلیری بھی ہو۔ شاید قسمت مجھ پر مہربان تھی۔ جلد ہی جبار نامی ایک مفلوک الحال نوجوان مل گیا۔ جس میں یہ ساری صفات تھیں۔ میں نے اس پر اپنا سنہرا جال ڈالا اور وہ میری پناہ میں آ گیا۔ میں نے اس پر مہربانی کی اور اس سے شادی کر لی۔ اسے تو گویا سارے جہاں کی دولت مل گئی۔ شادی کے بعد میں نے جبار کا تعارف سلیم اور اس کے گھر والوں سے بھی کرا دیا۔ میری شادی کے کچھ دن بعد سلیم ملک کے باہر چلا گیا لیکن میں نے اس کے گھر جانا برابر جاری رکھا۔ مین اکثر اپنے شوہر کو بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے پلان کے مطابق اپنی ایک سہیلی کے ذریعے سلیم سے اپنے تعلقات کے سلسلے میں خبریں پھیلانا شروع کیں۔ دھیرے دھیرے یہ خبر جبار تک پہنچی تو اس نے اس معاملے میں مجھ سے سوال کیا۔ میں نے اسے اس طرح ٹال دیا جس سے اس کا شک اور بڑھ گیا۔ آخر ایک دن اس نے قسم دے کر پھر سوال دہرایا تو میں نے سلیم سے اپنے تعلقات کا اعتراف کرتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے کہا اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے میرے ساتھ دھوکا ہوا کیونکہ سلیم نے مجھ شادی کرنے کا وعدہ کر کے میری عزت لوٹی تھی۔ مگر بعد میں اس نے غداری کی اور اب وہ ملک کے باہر چلا گیا ہے۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟

یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے تم میری ہو میں تمہارا ہوں تمہاری بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اس نے جوش میں آ کر کہا۔

میں انتہائی خوش قسمت تھی میری پلاننگ کامیاب ہو رہی تھی مگر میں نے جبار سے کہا آپ بہت عظیم ہیں لیکن جلد بازی اور غصہ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جلد بازی میں کام بگڑ جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر ٹھنڈے دماغ سے پلان تیار کر کے کام کرنا ہے تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میری بات سن کر جبار نے میری عقل کی داد دی اور کہا اچھا تم پلان تیار کرو۔

کافی سوچ سمجھ کر میں نے پلان بنایا اور جبار کو بتایا تو وہ خوشی سے ناچنے لگا حالانکہ پلان اس طرح کا تھا جس میں پورا خطرہ جبار کے لئے تھا اور میں صاف بچ جاتی۔

دوسرے دن پلان کے مطابق ہم دونوں سلیم کے گھر گئے۔ سلیم کے گھر کے لوگوں نے ہمیشہ کی طرح خوش آمدید کہا۔ دوپہر کا وقت تھا سبھی لوگ اندر کے کمرے میں بیٹھے ٹیلی

ویڑن دیکھ رہے تھے ہم لوگ بھی وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جبار نے چائے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلیم کی بہن چائے بنانے کے لئے اٹھی تو جبار نے اسے روکا اور مجھ سے چائے بنا کرلانے کو کہا۔ میں کچن میں گئی۔ چائے بنائی اور لاکر سب کو دی۔ سب نے چائے پی، اور پھر وہی ہوا سب لوگ بے ہوش ہو گئے۔ جبار نے پھرتی سے چاقو نکالا اور سب پر وار شروع کردیا اس پر جنون سوار تھا۔ ٹھیک اسی وقت سلیم کی بہن شہلا جو شاید نہا رہی تھی باتھ روم سے نکلی اور اس منظر کو دیکھ کر سیدھے کوٹھے پر بھاگی اور شور مچانا شروع کر دیا اس اچانک واقعے سے ہم لوگوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ جبار کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔ وہ بھاگا مگر تب تک محلے کو لوگ اکٹھا ہو چکے تھے چند جوانوں نے اسے دوڑا کر پکڑ لیا اس بیچ میں وہاں سے فرار ہو چکی تھی مگر جبار کی نشان دہی پر پولیس نے مجھے بھی گرفتار کر لیا۔ اگر مجھ کو تھوڑا وقت مل جاتا تو میں شہر ہی سے فرار ہو جاتی اور کسی دوسرے شہر میں نئی زندگی پرانے ڈھرے پر چل پڑتی۔ مجھے امید تھی کہ انتقام کی آگ بجھ جانے کے بعد میرا بزنس بہت آرام سے چلتا مگر قسمت میں تو یہ لکھا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں نے والدہ کی نصیحت مانی ہوتی تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ مجھے اپنے اعمال کی سزا ملی ہے اور میں اس کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے کسی کے آنے کی خبر سن کر میں پاگل ہو گئی تھی۔

کہانی سننے میں کتنا وقت گذرا اس کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بیت چکی ہے صبح صادق ہو رہی ہے میں نے کہا۔ آرزو سامنے دیکھو صبح کا نیا سورج طلوع ہو رہا ہے تمہاری زندگی میں بھی نیا سورج نکل سکتا ہے عہد کر لو ماضی کو فراموش کر کے نئے حوصلے سے مستقبل کے لئے سوچو۔

ہاں! ضرور...... ضرور...... میں نے پہلے ہی عہد کر لیا ہے کہ اپنے ماضی کی ساری تاریکی

کو میں اس کال کوٹھری میں ہی چھوڑ کر نکلوں گی۔ جب تک یہاں رہوں گی اپنے کو کفارے کی آگ میں تپاتی رہوں گی تا کہ جب اس آگ سے چھٹکارا ملے تو میرا ماضی اس آگ میں بھسم ہو چکا ہو۔ میرا یہ عہد اپنے سے آپ سے اور خاص طور پر اپنے رب سے ہے یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ سے شبنم کی طرح آنسو بہہ نکلے۔ میرے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی۔
''اللہ تجھے ثابت قدم رکھے۔''

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں

.....مگر وقت کبھی نہیں رکتا۔ گھڑی کی سوئیاں برابر گردش کرتی رہتی ہیں۔ سدھیر اور سدھا دونوں اپنی اپنی کوشش میں لگے رہے مگر ہوا وہی۔ مرد نے اپنی تیز رفتاری سے عورت کو شکست دے دی۔ اب پھر دونوں کی جسمانی اور ذہنی پوزیشن اس طرح ہوگئی تھی جیسے کہ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہیں۔

گھڑی کی سوئیاں

کالج کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ہونے والے پروگرام کے آخری دن اسی کالج کی سائنس کی طالبہ مس سدھا نے جب تقریری مقابلہ کے لئے دیے گئے عنوان ''عشقیہ شاعری اور محبوب کا تصور'' پر اپنی تقریر شروع کی تو اس کے اندازِ تقریر اور دلائل سے سامعین پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ فنِ خطابت، دلکش آواز اور خداداد حسن نے اس کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔ پورے ہال میں صرف سدھا کی آواز ہی گونج رہی تھی باقی ہر چیز ساکت و جامد محسوس ہو رہی تھی۔

تقریر ختم ہوتے ہی لوگ حصار سے باہر آ گئے اور ہال میں تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے یہ محسوس ہوا کہ ہال میں زندگی لوٹ آئی سبھی کی زبان پر صرف سدھا کی تقریر کے لے داد و تحسین کے کلمات تھے۔

چند لمحات کے بعد جج صاحبان کا فیصلہ سنایا گیا اور حسبِ توقع مس سدھا کو اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ مہمان خصوصی سے انعام حاصل کر کے جب سدھا ہال سے باہر نکلی تو اس کو اس کی سہیلیوں اور کالج کے ساتھیوں نے گھیر لیا۔ سبھی لوگ مبارک باد دے رہے تھے اسی مجمع میں سدھیر بھی تھا جو سدھا کو مبارک باد دینے والوں میں پیش پیش تھا۔ سدھا نے اس کی

تعریف کے جواب میں مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

سدھیر جو سدھا کی خوبصورتی کا پہلے ہی سے مداح تھا آج کی تقریر سن کر اس کا دیوانہ ہو گیا۔ تقریر میں جن خیالات کا اظہار سدھا نے کیا تھا سدھیر نے اس کو سدھا کے ذہن وشعور کا عکس سمجھ لیا۔ سدھیر میں پوشیدہ مرد کی فطرت نے انگڑائی لی اور وہ ہر حال میں سدھا کا قرب حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہو اٹھا۔

سدھا سے رسم و راہ بڑھانے میں سدھیر کو کامیابی تو ملی مگر چند ملاقاتوں کے بعد ہی سدھیر کو یہ احساس ہو گیا کہ دونوں کے خیالات میں اتنا تضاد ہے جتنا کہ گھڑی کی سوئیوں میں ساڑھے گیارہ بجے ہوتا۔ سدھیر نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور برابر ملاقاتوں کا سلسلہ قائم رکھا۔ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے اس نے سدھا کے خیالات اور جذبات میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ اپنی پر فریب مگر دلکش باتوں سے اس نے خیالات اور احساسات کی کھائی کو اس حد تک پر کر دیا کہ ان کی پوزیشن پونے بارہ بجے والی سوئیوں کی سی ہو گئی۔ دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ جاری تھی سدھیر اپنی کوشش میں اور سدھا اپنی کوشش میں۔ مگر سدھیر کی رفتار تیز رہی اور سدھا کی سست۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سدھیر نے اپنے خیالات کو سدھا کے ذہن میں اس طرح بٹھا دیا کہ اس کے دل میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ دونوں میں اتنی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی کہ جسم کے فاصلے بھی مٹ گئے اور وہ اس پوزیشن میں ہو گئے جیسے کہ گھڑی کی سوئیاں بارہ بجے ہوتی ہیں۔

سدھیر نے اپنی زندگی کی معراج حاصل کر لی تھی۔ اس کی آرزوؤں کی تکمیل ہو چکی تھی اب بھنورے کے لئے کلی میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی تھی لہٰذا وہ اس سے کترانے لگا۔ کلی کی خواہش تھی کہ یہ بھنورا اسی کا ہو کر رہ جائے مگر وقت کبھی نہیں رکتا گھڑی کی سوئیاں برابر گردش

کرتی رہتی ہیں۔ سدھیر اور سدھا دونوں اپنی اپنی کوشش میں لگے رہے مگر ہوا وہی۔ مرد نے اپنی تیز رفتاری سے عورت کو شکست دے دی۔ اب پھر دونوں کی جسمانی اور ذہنی پوزیشن اس طرح ہوگئی جیسے کہ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہیں۔

مرد ایک بار پھر اپنی فطرت میں کامیاب ہوگیا۔

☆☆☆

ایک خواب

لیکن لوگ اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب انھوں نے ملزمان کے چہروں کو مختلف پایا کیونکہ یہ چہرے وہ نہیں تھے جو کچھ لوگوں نے پہلے دیکھے تھے۔ چہ میگوئیاں ہوتیں۔ پھر آہستہ آہستہ انتشاری کیفیت پیدا ہونے لگی۔ فرض شناس پولس نے ہجوم کو لاٹھی سے منتشر کر دیا۔

ایک خواب

''انسپکٹر وکرم کا ایک اور کارنامہ'' مقامی شام نامہ میں اس سرخی پر نظر پڑتے ہی میں اس کی تفصیل پڑھنے لگا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایماندار اور فرض شناس انسپکٹر نے شہر کے ایک فیشن ایبل علاقہ کے ایک فلیٹ پر کامیاب چھاپہ مار کر جسم کا بیوپار کرنے والی کچھ لڑکیوں کو ان کے ماڈرن مجنوؤں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدہ افراد میں کچھ سفید پوش بھی ہیں تفتیش کے بعد اہم انکشافات ہونے کے ساتھ اسکینڈل میں شامل چہرے بھی بے نقاب ہونے کی توقع ہے۔

اس خبر سے شہر میں عام طور پر انسپکٹر وکرم کی فرض شناسی کو سراہا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ہر شخص کو یہ امید تھی کہ اس دفعہ محکمۂ داخلہ اس ایماندار انسپکٹر کو ترقی ضرور دے گا۔ دوسری طرف اس حادثے کے بعد اسکینڈل کے سرکردہ لوگ برابر تھانے پر ٹیلی فون کے ذریعہ انسپکٹر وکرم پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اس کیس کو رفع دفع کر دیں۔ لیکن انسپکٹر وکرم نے کسی بھی سفارش کو نہ مانا۔ اسکینڈل میں شامل لوگ یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ اگر لڑکیاں عدالت میں پیش کی گئیں تو ان کے خاندانوں کی نام نہاد عزت مٹی میں مل جائے گی۔ لہٰذا کوئی سبیل اس کے تدارک کی کرنی چاہئے۔ آخر یہ طے پایا کہ جب ہم افران بالا

تک ماہانہ حصہ دیتے ہیں تو کیوں نہ ان کے ذریعہ کیس کو کسی دوسرے انسپکٹر کو دلا دیا جائے؟ اس حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہوئے ایک افسر سے رابطہ قائم کر کیس انسپکٹر وکرم سے انسپکٹر جگدیش کو ٹرانسفر کرنے کے لئے حکم نامہ جاری کرا دیا گیا۔

کیس ٹرانسفر ہوتے ہی تمام گرفتار شدہ لڑکیوں کو باعزت طور پر گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ان کی جگہ پر بازارِ حسن کی بدنام عورتوں کو لا کر خانہ پری کر دی گئی۔

دوسرے دن تھانے پر ایک ہجوم ان ملزمان کے دیدار کے لئے جمع تھا لیکن لوگ اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب انہوں نے ملزمان کے چہروں کو مختلف پایا۔ کیونکہ یہ چہرے وہ نہیں تھے جو کچھ لوگوں نے پہلے دیکھے تھے۔ چہ میگوئیاں ہوئیں پھر آہستہ آہستہ انتشاری کیفیت پیدا ہونے لگی۔ فرض شناس پولیس نے ہجوم کو لاٹھی سے منتشر کر دیا۔

اسی شام نامہ میں یہ خبر پڑھ کر عوام میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ انسپکٹر وکرم کا تبادلہ ضلع سے باہر کر دیا ہے اور فوری طور پر چارج انسپکٹر جگدیش نے لے لیا ہے۔

دوسری طرف اس کامیابی کی خوشی میں ایک جشن برپا تھا جام چھلک رہے تھے اسی موج و مستی کے عالم میں ایک شخص نے تان لگائی کہ جب تک ہمیں ان افسران کی سرپرستی حاصل ہے بدعنوانی کو ختم کرنے کی بات سوچنا جاگتے میں خواب دیکھنے کی طرح ہے اور جو ایسے خواب دیکھے گا اس کا حشر انسپکٹر وکرم جیسا ہوگا۔

☆☆☆

منظور پروآنہ

کا

گیارہواں افسانہ

دوھرا کردار

اِس طنزیہ خیال کے ساتھ دلچسپ ہے کہ ''قانون بنانے
کا مطالبہ کرنے کا اس کو حق حاصل ہے، جو قانون توڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔''

انور ندیم

دوہرا کردار

یار! تم بھی نرے بیوقوف ہو۔قانون بنانے کا مطالبہ کرنے کا اس کو حق حاصل ہے جو قانون توڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔لیڈر اور عوام میں یہی فرق ہے۔

دوہرا کردار

گھڑی نے پانچ بجائے اور لوگ دفتر سے چلنے لگے۔ میں نے بھی اپنا سامان سمیٹا۔ بیگ اٹھایا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ راہداری میں مسٹر اندر سین گپتا مل گئے انہوں نے حسبِ عادت اطلاع فراہم کرائی کہ باہر کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔

''کیسا جلسہ'' میں نے پوچھا

''ارے کسی پارٹی کا ہے۔'' وہ بولے

بات کرتے ہوئے ہم لوگ مین گیٹ پر پہنچ گئے تو دیکھا سامنے سڑک پر ایک مجمع اکٹھا ہے۔ ایک نیتا جی بہت جوش کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ کسی لیبر یونین کے لیڈر ہیں۔ جب اور قریب گیا تو آواز بھی سنائی دینے لگی۔ نیتا جی کہہ رہے تھے آج ملک کی جو بدحالی ہے اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کو رائج رکھنا چاہتے ہیں یہ نظام دیش کے غریبوں کو اور غریب بنا رہا ہے جبکہ امیر اور تیزی کے ساتھ امیر ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ کامگاروں، مزدوروں اور کاریگروں کا استحصال ہو رہا ہے۔ رات دن محنت اور مشقت کرنے والے یہ مزدور اجرت کے نام پر چند روپے پاتے ہیں۔ جبکہ ان کی اس محنت سے تیار مال کو یہ ساہوکارانہ نظام دنیا کی منڈیوں میں اچھے داموں میں فروخت کر

اپنی تجوریوں کو بھر رہا ہے۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اجرت اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ اس سے اپنے خاندان کے لئے دووقت کی روٹی بھی مشکل سے حاصل کر پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ برا حال بچوں اور عورتوں کا ہے ان سے کام تو پورے طور پر لیا جاتا ہے لیکن اجرت انتہائی کم دی جاتی ہے یہ سب اس وجہ سے ہے کہ حکومت ان سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کو ہمیشہ شہ دیتی ہے اور سرپرستی کرتی ہے۔ اگر اس حالت کو بدلنا ہے تو ہمیں اس حکومت کو بدلنا ہوگا اور ایک ایسی حکومت کو لانا ہوگا جو ایسے قانون بنا سکے جس سے کاریگروں اور مزدوروں کا مفاد متاثر نہ ہو۔ ان کے لئے کم سے کم شرح مزدوری طے کر دی جائے۔ عورتوں کے ساتھ مزدوری میں امتیاز نہ برتا جائے۔ بچہ مزدوری کے قانون کو سختی سے لاگو کیا جائے۔ بندھوا مزدوری کی رسم کا مکمل خاتمہ ہو سکے۔ ایک ایسا نظام بنایا جائے جس میں مل مالک اور کاریگر دونوں منافع میں حصہ دار ہوں اور یہ سماج سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل سے آزاد ہو سکے۔

تقریر ختم ہوئی میں بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن بار بار میرے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ واقعی اگر ایسا ہو جائے تو اپنے ملک کی حالت ہی بدل جائے۔ اگلے چوراہے پر پہنچ کر میں ایک ٹیمپو میں بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر اترا۔ کرایہ دے کر آگے بڑھا تو سامنے چند لوگوں کی بھیڑ اکٹھا نظر آئی۔ میں نے سوچا شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ وہی نیتا جی ایک رکشہ والے پر برس رہے تھے۔ تو مجھے جانتا نہیں میں تجھے ابھی بند کرادوں گا۔ اتنی دور کے دس روپیہ مانگتا ہے۔

"بابو جی میں نے بالکل مناسب پیسے مانگے ہیں آپ کسی سے پوچھ لیں۔" رکشہ والے نے کہا

"میں کسی سے کیوں پوچھوں کیا میں جانتا نہیں کہ کتنے پیسے ہوئے۔ پانچ روپیہ دیتا ہوں

لینا ہولو ورنہ بھاگ''۔نیتا جی گر جے

ارے بھائی صاحب پانچ نہیں آٹھ روپئے دے دیجئے پانچ کم ہیں کچھ لوگوں نے مداخلت کی۔اگر کم ہیں تو آپ ہی دے دیجئے میں تو پانچ سے زیادہ دینے والا نہیں۔نیتا جی نے کہا۔

''میں آپ سے لڑ نہیں سکتا بوڑھا ہوں اور غریب بھی آپ جو چاہیں دے دیں نہ چاہیں نہ دیں مگر مزدوری دس روپیہ ہی ہوئی۔''رکشہ والے نے جواب دیا۔''نیتا جی نے پانچ کا نوٹ رکشہ کی سیٹ پر رکھا اور آگے بڑھ گئے لوگ چہ می گوئیاں کرتے رہے میں بھی اداس من کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔نیتا جی اپنے ساتھی کے ساتھ آگے آگے۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔اس نے مزوری ٹھیک مانگی تھی اور تم کو تو ان مزدوروں کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے کیونکہ تم تو ان کے لیڈر ہو۔ابھی ابھی تم نے کم سے کم شرح مزدوری مقرر کرنے کے لئے اتنی زوردار تقریر بھی کی تھی۔''نیتا جی کے ساتھی نے کہا۔

یار تم بھی بڑے بیوقوف ہو۔قانون بنانے کا مطالبہ کرنے کا اس کو حق حاصل ہے جو قانون توڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔لیڈر اور عوام میں یہی فرق ہے۔نیتا جی نے ہنس کر کہا۔

اس جواب کو سن کر ذہن میں ایک سوالیہ نشان گھوم گیا۔کیا ایسے دہرے کردار کے لوگ ملک کی حالت بدل سکیں گے؟

☆☆☆

فریبِ نظر

فریب نظر کا یہ واقعہ میری آوارہ مزاجی اور آوارہ گردی کے لئے قدرت کا ایک تازیانہ تھا جس نے میری زندگی کی سمت بدل دی اس کے بعد سے میری آوارہ مزاجی کو لگام لگ گئی۔

فریبِ نظر

مجھے اس بات کا قطعی علم نہیں کہ کب اور کس نے یہ کہاوت دنیا میں رائج کی کہ آنکھوں دیکھا سچ، کانوں سنا جھوٹ۔ یعنی جو چیز آنکھ سے دیکھی جائے وہ سچ یعنی حقیقت اور جو صرف سنی سنائی ہو وہ جھوٹ۔ حالانکہ صحرا کے مسافروں کو چمکتی بالو آب جو، نظر آتی ہے۔ سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے والے کو سمندر اور آکاش کا ملن دکھائی دیتا ہے مگر یہ سچ نہیں ہوتا جبکہ یہ آنکھوں دیکھا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ فریب ہوتا ہے۔

لیکن ...... کبھی کبھی ایسے حادثات ہو جاتے ہیں کہ انسان کو اپنے آپ پر شک ہونے لگتا ہے کیونکہ دور کے مناظر میں فریب نظر ہو جائے تو مانا جا سکتا ہے مگر بالکل قریب کی چیز کو دیکھ کر بھی آپ کو دھوکا ہو جائے تو اسے کیا کہا جائے لیکن ایسا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا جسے سن کر آپ کو بھی حیرت ہو گی۔ اس واقعہ کی جب کبھی مجھے یاد آتی ہے تو میرے بدن میں ایک جھرجھری سی یہ سوچ کر محسوس ہوتی ہے کہ اگر اس دن اس حادثے کا شکار ہونے سے نہ بچ گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟

فروری کا آخری ہفتہ تھا روز کی طرح میں اس شام بھی حضرت گنج کی لَولَین کا چکر لگانے کے لئے گھر سے نکلا تو یہ خیال آیا کہ موٹر سائیکل میں پٹرول ریزرو میں ہے اس لئے پہلے پٹرول لینے کی غرض سے میں کیپٹل سنیما کے پاس واقع پٹرول پمپ پر پہنچ گیا پٹرول لے کر جب میں سڑک پر آیا

تو سول اسپتال کی فٹ پاتھ پر کھڑی ایک لڑکی کو دیکھ کر میرے پیر خود بخود بریک پر جم گئے۔ میں اس کی کالی گھنیری زلفوں، تیکھے نقوش اور کجراری آنکھوں کو شاید نظر انداز کر جاتا مگر غضب یہ ہوا کہ وہ میرے پسندیدہ فیروزی رنگ کے شلوار سوٹ میں تھی میری نظر اس کی نظر سے ملی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ مگر چند لمحوں میں ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ میں سڑک پر ہوں۔ میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی مگر شوق دیدار نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنے ہی طرف دیکھتے پایا۔ مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی میں نے موٹر سائیکل کو یوٹرن دیا اور جی۔ پی۔ او۔ پارک کے پاس لاکر پھر اس کی طرف دیکھا تو مجھے حیرت انگیز خوشی حاصل ہوئی کیونکہ وہ اب تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ سینما ہالوں، پارکوں کے پاس اکثر تتلیاں اپنے شکار تلاش کرتی ہیں میں نے سوچا چلو آج اسی کے ساتھ انجوائے کیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر موٹر سائیکل آگے بڑھادی چونکہ ساتھ میں لڑکی تھی اس لئے میں نے ایک سناٹے والی سڑک چنی اور موٹر سائیکل اسی طرف موڑ دی۔ میرے موٹر سائیکل موڑتے ہی اس نے سوال کیا۔

''کہاں چل رہے ہو؟''

''وہاں جہاں ہمارے تمہارے سوا کوئی نہ ہو۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''نام سے کیا کام۔ ویسے نام میرا مینا ہے مگر کہنے والے دلربا کہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''غلط بالکل غلط'' دلربا نہیں دل چور ہونا چاہئے تمہارا نام۔ ایک ہی نظر میں دل کا کام تمام کر دیا۔ چرا لیا دل' میرے جواب پر وہ زور سے ہنسی اور بولی ''تم بھی تو دل کھولے گھوم رہے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری شرٹ کے کھلے بٹن سے جھانکتے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے بدن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں اپنی پیٹھ پر اس کے جسم کی حرارت سے تصورات کی دنیا میں غوطہ زن تھا۔ میں بلا ضرورت بار بار بریک لگا کر اس کے جسم کو اپنے

جسم سے ٹکرا رہا تھا۔ بیچ بیچ گاڑی اس طرح لہراتا کہ خوف کے مارے وہ اپنے بازوؤں کو میری کمر کے گرد لپیٹ لیتی تھی۔ میں اس حسین تصورات کی دنیا میں مگن تھا کہ اچانک میرے کان میں ''اوئی اللہ کیا مار ہی ڈالو گے'' کے الفاظ دھماکے کی طرح سنائی پڑے جس سے میرے بدن میں ایک برق سی دوڑ گئی اور میں پسینہ میں نہا گیا۔

''اوہ! یہ تو بہت برا ہے'' آخر اس سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے۔ میں نے موٹر سائیکل شہر کی طرف موڑ دی۔ تھوڑی ہی دیر میں شہر سے ملے ایک نو تعمیر علاقہ میں ایک ہوٹل نظر آتے ہی مجھے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ میں نے ہوٹل کے سامنے موٹر سائیکل روکی وہ فوراً اتر پڑی۔ اس کے اترتے ہی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر اس نے کہا۔ ''کیا بات ہے یہاں کیوں رک گئے؟ کیا یہیں لانے کی بات کر رہے تھے۔ یہاں تو بہت لوگ ہیں۔؟''

نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے ایک بہت اہم کام یاد آ گیا ہے۔ جسے نہ کرنے پر بہت سے کام بگڑ جائیں گے۔ بس یوں سمجھو میں گیا اور کام نمٹا کر دس پندرہ منٹ میں واپس آیا۔ جب تک تم یہاں بیٹھ کر چائے وغیرہ لو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پرس سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور میں وہاں سے سیدھا گھر لوٹ آیا۔ مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ جن لوگوں نے میرے ساتھ اس کو دیکھا ہوگا انہوں نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی۔ اگر یہ راز کسی ویران وسنسان جگہ پر عیاں ہوتا تو کیا ہوتا؟ کیونکہ میں نے جسے ایک خوبصورت لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا حقیقت میں وہ ایک نوخیز ہجڑا تھا۔ ایک ایسا ہجڑا جس پر کچھ لوگ کئی خوبصورت لڑکیاں قربان کر سکتے تھے۔ مگر میرے پاس ایسی جرأت رندانہ نہیں تھی۔ میں ایسا کرنے سے قاصر تھا۔

فریبِ نظر کا یہ واقعہ میری آوارہ مزاجی اور آوارہ گردی کے لئے قدرت کا ایک تازیانہ تھا۔ جس نے میری زندگی کی سمت بدل دی اس کے بعد سے میری آوارہ مزاجی کو لگام لگ گئی۔

☆☆☆

انتقام

عام طور پر عیاش مرد، عورتوں کے جسم کو کھلونا سمجھ کر تو کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ اس رات تم نے بھی میرے جسم کے کھلونے کو کئی بار توڑا۔ میں مسکراتی رہی اپنی کامیابی پر اور تم اس گمان میں رہے کہ میں تمہارے کھیل سے آسودگی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن..................

انتقام

آج مجھے فیکٹری پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ میں جیسے ہی اپنے آفس میں جا کر بیٹھا۔ میری پرائیوٹ سکریٹری نے ضروری کاغذات میرے سامنے لاکر رکھ دیے جس میں ایک لفافہ بھی تھا جس پر سرخ روشنائی سے جلی حروف میں ''ذاتی انتہائی اہم'' تحریر تھا۔ کہاں سے آیا ہے یہ خط؟ سوچتے ہوئے میں نے لفافہ پر بھیجنے والے کا نام دیکھا تو میرے منھ سے نکلا...... گڈ ...... اچھا...... رشمی کا ہے۔ رشمی کا نام ذہن میں فیڈ ہوتے ہی دماغ کی سی۔ ڈی۔ خود بخود آن ہوگئی اور سارے واقعات فلم کی طرح میری نظر کے سامنے ناچنے لگے۔

چند دن پہلے ہی کی تو بات ہے آج ہی طرح میرے آنے پر میری پرائیوٹ سکریٹری نے کاغذات میرے سامنے رکھتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ باہر کی مس رشمی آپ سے ملنے کی منتظر ہیں۔ شاید کسی فرم کی نمائندہ ہوگی یہ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اچھا بھیج دو''

ہیلو کی آواز سن کر میں نے سر اٹھایا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جینس اور ٹاپ پہنے دھوپ کا چشمہ لگائے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی ناک پر کالا تل دیکھ کر میں نے اسے پہچاننے میں دیر نہ کی۔ یہ وہ لڑکی تھی جسے دو سال قبل میں نے اپنے یہاں سے بے عزتی کے ساتھ نکال دیا تھا۔ مگر اس کا یہ بے باکانہ انداز دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ مگر خوف بھی محسوس ہوا۔ میں نے شر

مندگی والے لہجہ میں کہا۔ رشمی تم! کب آئیں۔ تم نے اپنا چولا ہی بدل ڈالا۔

''وقت بہت کچھ سکھا دیتا ہے اور بہت کچھ بدل دیتا ہے۔'' رشمی نے جواب دیا۔ رشمی کو اس قاتلانہ انداز میں دیکھ کر میرے اندر کا شیطان پھر جاگنے لگا۔ میں نے مکارانہ انداز میں کہا۔ ''رشمی مجھے اس واقعہ پر افسوس ہے۔''

تم کو افسوس ہو یا شرمندگی یہ تمہاری پریشانی ہے۔ مگر میں تمہاری احسان مند ہوں کیونکہ نہ تم نے میری بے عزتی کی ہوتی اور نہ میں دہلی چھوڑ کر اپنے ماما کے پاس بامبے جاتی۔ اور نہ وہ ترقی کر پاتی جو بامبے جا کر مجھے ترقی کا موقع ملا۔ میں اپنی فرم کے کام سے آئی ہوں۔ سوچا چلو اپنے محسن اور اپنے پہلے محبوب سے ملاقات کر لی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اکیلے زندگی گذارنا مشکل ہے اس لئے کسی نہ کسی کا دامن تھامنا چاہتی ہوں۔ لیکن...... اسے میرا پاگل پن سمجھو یا کچھ اور کہ میں ایک آخری خواہش لے کر آئی ہوں وہ یہ کہ میں کسی دوسرے کی ہونے سے پہلے آخری بار ایک رات اپنے پہلے محبوب کی بانہوں میں گذارنا چاہتی ہوں۔ میں ہوٹل اشوکا میں ٹھہری ہوں اگر ہو سکے تو میری یہ خواہش پوری کر دو۔ میں دوبارہ کبھی تمہاری راہ کا پتھر نہ بنوں گی۔ مجھے امید ہے تم انکار نہ کرو گے۔ تمہارا انتظار رہے گا۔ یہ کہتے ہوئے رشمی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

ہوٹل اشوکا میں کیوں رکی ہو میری کوٹھی اتنی بری نہیں۔ میں نے کہا

نہیں! یہ ممکن نہیں میں تم سے اپنی قربت کی قیمت نہیں چاہتی؟ آج کیا...... اس وقت جب مجھے ضرورت تھی میں نے یہ نہ چاہا۔ آج تو میں اس حیثیت میں ہوں کہ کسی کا احسان نہ لوں۔ تم اسے میری طرف سے گفٹ سمجھو۔ اچھا چلتی ہوں۔ رات انتظار رہے گا۔ کل صبح کی فلائٹ سے واپسی ہے۔ ہاتھ ہلا کر بائی۔ بائی کہتے ہوئے رشمی چلی گئی۔ مگر میں بے چین ہو گیا۔ بلکہ ذہنی طور پر مفلوج سا۔

آخر اس رات کے دوسرے تمام پروگرام ملتوی کر میں ہوٹل اشوکا پہنچا۔ رشمی وہاں مجھے

سراپا انتظار ملی۔ رات رشمی کے ساتھ گذار کر صبح روانگی کے وقت میں نے رشمی سے کہا۔ میری فرم کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے ہیں جب چاہو آسکتی ہو...... اپنی مرضی اور شرائط کے ساتھ......

ہوسکتا ہے میرا آفر رشمی کو منظور ہو اس لئے یہ ذاتی خط بھیجا ہو یہ سوچتے ہوئے میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر خط تھا...... میں نے پڑھنا شروع کیا۔

رمیش..........!

ہوٹل اشوکا کی وہ رات مجھے ابھی تک نہیں بھولی اور اس کا نشہ ابھی تک مجھ پر اثر انداز ہے ۔ امید ہے کہ تم بھی اس رنگین رات کے تصور کے حصار سے نہ نکل سکے ہوگے۔ اس کا خمار تم کو ابھی تک بدمست کئے ہوگا اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے کیونکہ تم نے اپنے طور پر اس رات مجھ پر فتح حاصل کی تھی اور اس خوشی میں تم نے میرے لئے شاندار پیش کش بھی کی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خواب تھا، اب اس رنگین خواب کی بھیانک تعبیر سنو......

یاد کرو کہ کس طرح تم نے مجھ بے سہارا کو وعدوں کے دلفریب جال اور حسین خوابوں کے طلسم کے حصار میں جکڑ کر میرے جسم کا مالکانہ تصرف کیا۔ مگر جب میں نے تم سے شادی پر اصرار کیا تو تم نے مجھ پر بے بنیاد الزامات لگا کر بے عزت کیا اور نوکری سے نکال دیا۔ اس وقت دہلی جیسے شہر میں میرا کوئی ٹھکانہ نہ بچا تھا۔ دہلی چھوڑنا ہی مناسب تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ دلی نہیں تو کہاں؟ اچانک مجھے بامبے میں رہنے والی اپنی ایک سہیلی کا خیال آیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت والی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے میں بامبے آگئی۔ سہیلی نے میری داستان سنی تو دلاسا دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی کچھ ایسے ہی حالات میں بامبے آئی تھی۔ میں نے ہمت سے کام لیا تھا تم بھی ہمت سے کام لو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کچھ دن آرام کرو ذرا نارمل ہو جاؤ۔ پھر تمہارے لئے نوکری تلاش کروں۔

کچھ دن بعد اس نے وہی کام میرے لئے تلاش کیا جو وہ کر رہی تھی۔ یعنی "بار

ڈانسر'' مرتا کیا نہ کرتا۔ میں ایک غیر معروف بار میں ڈانسر ہوگئی۔ قلیل آمدنی میں بامبے جیسے شہر کا خرچ خاص طور پر آرائش وزیبائش کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ میں نے اس کا تذکرہ اپنی سہیلی سے کیا تو اس نے مجھے دوسرا راستہ دکھایا۔ اس نے کہا۔ بار میں ڈانس کے ذریعہ اپنے جسم کی نمائش اور اداؤں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بناؤ پھر دیکھو دولت کیسے آتی ہے۔ آج دولت ہی معیار ہے عزت کی۔ رمیش تمہاری بے وفائی نے مجھے مرد ذات سے نفرت کا جذبہ دیا۔ میں نے مرد ذات سے بدلے کی غرض سے یہ راہ چن لی اور اسی راہ پر چل پڑی مگر عام روش سے ہٹ کر۔ میں نے نوجوانوں کے بجائے بوڑھے امیر عیاشوں کو اپنا شکار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں میرے پاس دولت کا ڈھیر لگ گیا۔ میں اس میں ایسی مگن ہوئی کہ ساری احتیاطوں کو فراموش کر گئی۔ نتیجہ میں ایک بار ان چاہئے بوجھ کو ختم کرانا پڑا۔ اسی کے ساتھ وہ عمل جراحی بھی کہ پھر ایسے ان چاہے بوجھ پالنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا گیا۔ مگر تنہائی میں تمہاری بے وفائی کا خار میری روح کو زخمی کر جاتا۔ میں سوچتی میری زندگی کو اس راہ تک لانے کے تم ذمہ دار ہو۔ انتقام کا شعلہ میرے قلب کو زخمی کرتا مگر یہ سمجھ میں نہ آتا کہ انتقام کس طرح لیا جائے۔ ادھر کچھ مہینوں سے مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے جسم کی توانائی ختم ہو رہی ہے پژمردگی عود کر آئی ہے۔ میں نے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ انہوں نے کئی ٹیسٹ کرائے اور جب رپورٹ آئی تو پتہ چلا کہ مجھے ''ایڈس'' کے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ کب اور کس نے میرے جسم میں یہ زہر داخل کیا۔ مجھے علم نہ تھا۔ دل کی تسلی کے لئے تین اور ٹیسٹ کرائے مگر سب کا ایک ہی رزلٹ تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ ایک رات اسی الجھن میں نیند نہ آنے کی وجہ سے ذہن بھٹک رہا تھا کہ یکا یک یہ خیال آیا کہ یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے اور سب سے بہتر انتقام یہ ہوگا کہ یہ آگ تمھارے جسم میں داخل کر دی جائے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں پھر سے توانائی آگئی۔ میں نے ایک منصوبہ بنایا اور اسی پلان کے تحت تم سے دہلی میں ملاقات کی اور پھر جو ہوا وہ تم کو معلوم ہے۔

عام طور پر عیاش مرد، عورتوں کے جسم کو کھلونا سمجھ کر کھیلنا اور توڑنا پسند کرتے ہیں اس رات تم نے بھی میرے جسم کے کھلونے کو کئی بار توڑا۔ میں مسکراتی رہی اپنی کامیابی پر۔ اور تم اس گمان میں رہے کہ میں تمہارے کھیل سے آسودگی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن دراصل یہ مسکراہٹ اس سکون کی تھی جو انتقام کے شعلے کی تپش ختم ہونے سے مل رہی تھی۔ قلب کا زخم ایک شگفتہ گلاب بن گیا ہے میں اس کی خوشبو کے سہارے زندگی کو آخری سانس تک سکون سے گذار دوں گی۔ مگر میں نے جو آگ تمہارے جسم میں داخل کر دی ہے اس کی ہر چنگاری تم کو میری یاد دلاتی اور تڑپاتی رہے گی۔ زندگی کی آخری سانس تک تم مجھے فراموش نہ کر سکو گے...... اور یہی میری فتح ہے میں نے اپنی جیسی تمام عورتوں کی طرف سے انتقام لے لیا ہے مجھے اپنے اس عمل پر کوئی افسوس یا شرمندگی نہیں بلکہ میری چشمِ تصور وہ منظر دیکھ رہی ہے کہ لوگ تمہاری طرف نفرت سے اشارہ کر کے بتا رہے ہیں کہ یہ ایڈس زدہ ہے یہ سوچ کر ہی میری روح کو سکون مل رہا ہے۔ تمہاری تسلی کے لئے میڈیکل رپورٹ بھی بھیج رہی ہوں...... بس۔

فتح مند........... رشمی

خط پڑھ کر رمیش کے حواس اڑ گئے۔ اس نے فوراً میڈیکل رپورٹ کو دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی...... نہیں...... نہیں۔

چیخ سن کر اس کی پرائیوٹ سکریٹری کمرے میں آئی تو رمیش کو فرش پر پڑے دیکھا۔ ہاتھ میں خط تھا۔ فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے چیک اپ کے بعد کہا۔ ''کوئی بہت گہرا صدمہ پہنچا ہے۔''

پرائیوٹ سکریٹری نے اس خط کو پڑھا تو اصل راز کھلا اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ لوگ تبصرہ کر رہے تھے کہ دولت کے نشے میں مجبور عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے والا شکاری خود اپنی ہوس کا شکار بن گیا۔ برے کام کا برا نتیجہ۔

☆☆☆

پیغام

جو شخص مخلوقِ خدا کے حقوق ادا کرتا ہے۔ یقیناً وہ حقوق اللہ پہلے ادا کرے گا۔ اس طرح وہ مخلوقِ خدا کا محبوب بننے کے ساتھ اللہ کا پسندیدہ بندہ بھی بن جاتا ہے۔ ایسے انسان کی موت اس کی موت نہ ہو کر زندگی بن جاتی ہے۔ ایسے لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

پیغام

میری یہ پرانی عادت ہے کہ میں ہر صبح بعد نمازِ فجر ہوا خوری کے لئے نکل جاتا ہوں۔ میرا یہ معمول ہر موسم میں رہتا ہے مگر عام آدمیوں کی طرح میں صرف سیر کر کے واپس نہ لوٹ آتا بلکہ میرا معمول تھا کہ سیر سے واپسی پر راستہ میں پڑنے والے قبرستان میں رک جاتا اور اس شہرِ خموشاں میں سوئے ہوئے اہل قبور کے لئے دعائے مغفرت کرتا کچھ دیر چہل قدمی کرتا پھر واپس لوٹ آتا۔ اس شہرِ خموشاں میں مجھے بہت سکون ملتا۔ مگر یہاں رکنے کا اصل راز یہ تھا کہ اس گورِ غریباں میں جہاں چاروں طرف ویرانی چھائی رہتی تھی، صرف ایک قبر ایسی تھی جس پر اس ویرانی کا کوئی اثر نہ دکھائی دیتا تھا بلکہ اس قبر پر جلال و جمال کی ملی جلی روشنی کا عکس نظر آتا تھا جس نے مجھے اس قدر متاثر کر رکھا تھا کہ میرے قدم خود بخود اس قبر کے پاس رک جاتے۔ وہاں میرا اکثر کافی وقت گذر جاتا اور مجھے احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری کایا پلٹ دی۔

واقعہ اس طرح ہے سردی کا موسم تھا میں فجر کی نماز کے بعد حسب معمول سیر کے لئے نکلا۔ کہرا اتنا شدید تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا مگر راستہ مانوس ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے حسب معمول قبرستان میں داخل ہوتے ہی اہل قبور کے لئے دعائے مغفرت کی۔ پھر میرے قدم خود بخود اس مخصوص قبر کی طرف اٹھنے لگے جب میں اس قبر پر پہنچا تو کہرے کی شدت زیادہ بڑھ چکی تھی جس سے بچنے کے لئے میں قبر کے سرہانے لگے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھ بند

کرتے ہی مجھے جوئے سماعت میں کچھ ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی آواز دے رہا ہے۔ میں نے پوری توجہ کے ساتھ ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کچھ نظر نہ آیا۔ چھٹی حس نے احساس دلایا کہ آواز قبر سے آرہی ہے میں نے پوری توجہ اس آواز پر مرکوز کی تو مجھے سنائی دیا۔

برادرم! میں تم سے ہی مخاطب ہوں میری بات غور سے سنو" کل میں اس عالم میں تھا جس عالم میں آج تم ہو۔ مگر کل تم اس عالم میں ہو گے جس عالم میں آج میں ہوں۔"

یہ سن کر میں نے کہا۔ "بے شک آپ درست فرما رہے ہیں کیونکہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور دنیا کا ہر فرد اس بات کو جانتا ہے مگر مجھے یہ درس دینے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

پہلے میری بات غور سے سنو۔ آواز پھر ابھری۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں جس عالم میں ہوں اس میں کوئی عمل نہیں کر سکتا مگر تم جس عالم میں ہو وہاں عمل کرنے کی پوری مہلت ہے۔"

"ہاں یہ بات سچ ہے دنیا دارالعمل ہے اور ہر شخص اپنی بساط کے مطابق عمل کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو پھر سرگوشی ہوئی۔ مگر تم جس کو عمل کہہ رہے ہو وہ بے قصد عمل ہے اور بے مقصد زندگی ایک بوجھ ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو سفر پر روانہ ہونے سے پہلے زادِ سفر تیار کر لے۔ یہ دنیا ایک سرائے ہے اور ہر شخص کو یہ عارضی سرائے چھوڑ کر اپنی اصل منزل کے لئے سفر کرنا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ زادِ سفر کی تیاری کی جائے۔ وہی عمل سچا عمل ہے جو زادِ سفر بن سکے۔ اس لئے با مقصد عمل کرو یعنی انسانیت کے لئے کام کرو۔ انسانیت نام ہے مخلوقِ خدا کے حقوق ادا کرنے کا۔ جو شخص مخلوقِ خدا کے حقوق ادا کرتا ہے یقیناً وہ حقوق اللہ پہلے ادا کرے گا۔ اس طرح وہ مخلوقِ خدا کا محبوب بننے کے ساتھ اللہ کا پسندیدہ بندہ بھی بن جاتا ہے ایسے انسان کی موت اس کی موت نہ ہو کر زندگی بن جاتی ہے ایسے لوگ مرنے

کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور آخرت کے سفر میں کامیاب رہتے ہیں آنے والی نسلوں پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ نسل در نسل اس کا نام روشن رہتا ہے۔ تم نے پوچھا تھا کہ یہ بتانے سے میرا مقصد کیا ہے؟

تو سنو! تم جب بھی میری قبر پر آتے تو تم کو یہ تجسس رہتا تھا کہ میری قبر پر ویرانی کیوں نہیں؟ میں اس راز سے پردہ ہٹانا چاہتا تھا کہ میری قبر ویرانی سے محفوظ کیوں ہے۔ یاد رکھو باعمل آدمی کی قبر ہمیشہ روشن رہتی ہے اسی راز کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس لئے میرا مشورہ ہے کہ بامقصد زندگی گذارو جو دونوں عالم میں تمہیں کامیابی دلائے اور تمہارا نام روشن رہے۔

اس کے بعد آواز خاموش ہوگئی میں سکتہ کے عالم سے نکل چکا تھا۔ میرے دل کی دنیا بدل چکی تھی میں نے ایک عزم کرلیا۔ واپسی میں میری چال میں میرے عزم کی پوری توانائی موجود تھی۔

☆☆☆

بلیک منی وہائٹ بچہ

میں بہت خوش ہوں۔اب مجھے مکتی نہیں چاہئے۔اب یہ پاپ پنیہ بن چکا ہے۔جو میری آرزو پوری کرے گا اور میرے آنگن کو روشن کرے گا۔کل رات میں نے اس پر کروڑی مل کی مہر لگوا کر اسے پنیہ میں بدل لیا۔

بلیک منی وہائٹ بچہ

سیٹھ کروڑی مل نام کے کروڑی مل نہ تھے وہ واقعی کروڑوں کے مالک تھے۔ ایک کامیاب بزنس مین۔ ملک کے مختلف شہروں میں ان کی چار کپڑا ملیں ہیں جو وراثت میں ملی تھیں۔ انہوں نے ان کی جدید کاری کرا کر اس میں چار چاند لگانے کے ساتھ ہی ایک فیکٹری دوا کی بھی کھڑی کر دی تھی۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کا استحصال نہیں کیا ہر کام کی بھرپور اجرت دینے کے ساتھ تمام اسٹاف کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ رہتا۔ اس لئے لوگ ایمانداری سے کام کرتے۔ ہر کارخانہ کے لئے ایک ایک منیجر تھا جو سارا کام دیکھتا۔ ہیڈ آفس ممبئی میں رکھا۔ جہاں وہ خود عالی شان بنگلے میں رہتے تھے۔ گھر میں صرف دو فرد تھے وہ اور ان کی پتنی چنچل۔ ابھی تک گلشن حیات میں کوئی پھول نہ کھل سکا تھا۔ مگر کوٹھی ملازموں سے بھری تھی۔ کروڑی مل اکثر بزنس ٹور پر رہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی پتنی کو منیجنگ ڈائرکٹر بنا رکھا تھا۔ ممبئی کے ہیڈ آفس میں کرم چند داس منیجر تھا جو ان کی غیر موجودگی میں ان کی پتنی کے حکم کے مطابق سارا کام دیکھتا تھا۔ چونکہ چنچل سارا کام گھر پر ہی کرتی تھیں اس لئے کرم چند داس کا زیادہ وقت کوٹھی پر گذرتا۔ کروڑی مل کی ایک پرسنل سکریٹری تھی جس کا نام لتا تھا۔ بزنس ٹور میں کروڑی مل اسے ہمیشہ ساتھ رکھتے وہ بھی سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی۔ لتا کے کام کے اوقات مقرر نہ تھے ضرورت ہو تو دن اور رات

کام ورنہ آرام۔ مگر لتا کی قسمت میں شاید آرام کم تھا کیونکہ کروڑی مل سال میں آٹھ مہینہ اندرون ملک یا بیرون ملک بزنس ٹور پر ہی رہتے۔ اگر وہ ممبئ میں رہتے بھی تو دن بھر آفس، شام کو بزنس پارٹی یا پھر کسی کلب میں رہتے اور رات گئے اپنے آپ سے بے خبر نشے میں مست گھر آتے اور بے سدھ بستر پر دراز ہو جاتے اور پھر کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ شروع میں چینچل کو بڑی کوفت ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ بھی اس کی عادی ہو گئی تھی اب چینچل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ پتی اور پتنی کی ملاقات صرف ناشتہ کی میز پر ہوتی۔ لیکن چینچل اکثر سوچتی کہ آخر لتا ہی بزنس ٹور پر کیوں جاتی ہے۔ اس سلسلے میں چینچل نے جب کرم چند داس سے بات کی تو اس نے دبے لفظوں میں یہ بتایا کہ کروڑی مل بزنس ٹور صرف لتا کے جسم کی حرارت حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ لتا جب ممبئ میں ہوتی تو فائلوں کا بوجھ اٹھاتی اور جب ٹور پر ہوتی تو فائل کے مالک کا بوجھ اس پر ہوتا۔ وہ اسے اس لئے برداشت کرتی آ رہی تھی کیونکہ اس کے بدلے اس کے بینک اکاؤنٹ کی فیگر برابر بڑھ رہی تھی اور زندگی شاندار طریقہ پر گذر رہی تھی۔

جب سے چینچل کو اس کا علم ہوا۔ اس نے منیجر کرم چند داس پر عنایتوں کی بارش شروع کر دی۔ اسی کے ساتھ کاروباری معاملات کے سلسلے میں وہ کرم چند داس کو رات گئے تک روکے رکھتی۔ دھیرے دھیرے نوازشات کے بوجھ تلے دب کر کرم چند داس پوری طرح داس بن چکا تھا۔ اب یہ حال تھا ادھر کروڑی مل بزنس ٹور پر نکلتے ادھر کرم چند داس کی رات کی شفٹ شروع ہو جاتی۔ اس طرح چینچل کو بھی سکونِ جاں حاصل ہو رہا تھا۔

لتا سے پہلے جو سکریٹری رہیں وہ زیادہ دن تک اس زہر کو برداشت نہ کر سکیں اور نوکریاں چھوڑ کر چلی گئیں مگر لتا تو پوری طرح کروڑی مل جیسے تناور درخت پر امر بیل کی طرح چپک چکی تھی ساتھ ہی ساتھ ایسے انتظام بھی اس نے کر لئے تھے کہ بوجھ تو وہ اٹھائے مگر زہر جسم

میں نہ ٹھہر پائے۔ دوسری طرف چینچل کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کرم چند داس کے کرموں کا پھل محسوس ہونے لگتا تو وہ دیوی درشن کے نام پر دس بارہ دن شہر سے باہر رہتی اور مکتی پا کر لوٹتی۔

اس بار بھی سیٹھ کروڑی مل اپنی پرسنل سکریٹری لتا کے ساتھ بزنس ٹور پر نکلے ہوئے تھے پروگرام کے مطابق واپسی میں ابھی کئی دن باقی تھے کہ ایک صبح اخبار کی جلی سرخی کروڑی مل پر بجلی بن کر گری خبر تھی حکومت نے ہزار روپیہ کے نوٹ کا چلن بند کر دیا ہے۔ کروڑی مل کا سارا بلیک منی بڑے نوٹوں کی شکل میں تھا۔ جو اس خبر کے بعد ردی کے ٹکڑے ہو چکے تھے اپنی بے چینی کو ظاہر کرنے کے لئے کروڑی مل نے ہزار کے نوٹ کو سگریٹ پر لپیٹ کر سگریٹ جلائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ لتا نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا یہ کیا؟ کروڑی مل نے بغیر کوئی جواب دئے اخبار لتا کی طرف بڑھا دیا۔ خبر پڑھ کر لتا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ مگر چند منٹ بعد ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ لتا نے گم صم سیٹھ کو مخاطب کر کے کہا ''سر آپ کچھ نہیں جانتے؟

''کیا کہا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ہاں'' لتا بولی۔ میں بتاتی ہوں آپ کا روپیہ بیکار نہ ہوگا آخر آپ کے آدمی کس دن کام آئیں گے؟ ہم آج ہی واپسی کی تیاری کرتے ہیں ممبئی پہنچ کر ہم اپنے آدمیوں کے ذریعہ تھوڑی تھوڑی رقم مقررہ وقت کے اندر بینک سے تبدیل کرا لیں گے بدلے میں دس فیصد رقم انعام کی شکل میں دے کر منھ بھی بند کر دیں گے۔ اس طرح نوے فیصد رقم محفوظ رہے گی۔ کروڑی مل لتا کی اس تجویز کو سن کر جھوم اٹھے اور ملک واپسی کے لئے تیار ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت ممبئی میں چینچل کرم چند داس سے کہہ رہی تھی تم تو ماہر کھلاڑی ہو ہر بار نشانہ

صحیح لگتا ہے اس بار بھی ۔ ۔ ۔ مجھے کل رات ہی دیوی درشن کے لئے نکلنا پڑے گا تاکہ سیٹھ جی کے آنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں۔

دوسرے دن صبح ہی صبح سیٹھ کروڑی مل کی اچانک آمد نے کرم چند داس کے ساتھ چنچل پر بھی سکتہ طاری کر دیا۔ اب چنچل کا دیوی درشن کے لئے جانا ایک مسئلہ ہو گیا۔ کروڑی مل نے آتے ہی اپنی پتنی چنچل، پرسنل سکریٹری لتا اور ممبئی کے منیجر کرم چند داس کے ساتھ میٹنگ کی جس میں لتا کی تجویز پر فوری عمل درآمد شروع کرنے کی بات طے پائی۔ کرم چند داس اور لتا نے مل کر دوسرے لوگوں سے یہ کام انجام دلایا۔ اس میں بھی لتا نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔

جب اس تجویز پر غور کیا جا رہا تھا اس وقت چنچل کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ جس سے چنچل کے مضطرب دل کو سکون مل گیا۔ دن بھر کی تھکن اور اپنی کامیابی میں مگن جب کروڑی مل رات کے وقت جشن منانے کے لئے کسی کلب جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ چنچل نے انکا راستہ روکتے ہوئے کہا ”کیا آج بھی آپ باہر ہی جائیں گے؟“ اس خوشی میں مجھے شامل نہ کریں گے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج ہم اور آپ ایک ساتھ جشن منائیں۔ یہ کہتے ہوئے چنچل نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ کروڑی مل کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ کروڑی مل اس حصار میں بے بس ہو کر رہ گئے۔

چنچل نے ڈرنک کا انتظام بیڈ روم میں کیا۔ جام سے جام ٹکرائے۔ کروڑی مل پر نشہ چڑھنے لگا۔ جس رفتار سے کروڑی مل گلاس خالی کر رہے تھے۔ چنچل اسی طرح اپنے بدن کو کپڑوں سے آزاد کر رہی تھی۔ آخر کار کروڑی مل چنچل کو اپنی بانہوں میں لئے لڑکھڑاتے ہوئے بستر پر ڈھیر ہو گئے کافی عرصہ بعد کروڑی مل چنچل سے مل رہے تھے وہ سوچ رہے تھے کہ یہ واقعی بڑی چنچل ہے۔ رات بیت گئی کام تمام ہو گیا۔ صبح کروڑی مل اپنے دفتر چلے گئے۔ اب چنچل نے کرم چند داس کو گھر بلایا۔ کرم چند داس نے آتے ہی کہا مالکن اس بار تو

سیٹھ جی کے آنے سے سب گڑبڑ ہو گیا۔ اب مکتی کیسے ملے گی آپ کو!

تم بالکل بے وقوف ہو۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بہت خوش ہوں اب مجھے مکتی نہیں چاہئے اب یہ پاپ پنیہ بن چکا ہے جو میری آرزو پوری کرے گا اور میرے آنگن کو روشن کرے گا۔ کل رات میں نے اس پر کروڑی مل کی مہر لگوا کر اسے پنیہ میں بدل لیا۔ کروڑی مل کو صلاح دے کر لتا نے اس کا نوے فیصد روپیہ بچا تو دیا...... مگر وہ رہا تو بلیک منی ہی۔ مگر میں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ بچہ وہائٹ (جائز) ہو گیا۔

بلیک منی زندہ باد...... وہائٹ بچہ زندہ باد کہتے ہوئے چنچل نے کرم چند داس پر محبت کی مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆

ہمدردی یا دشمنی

رام شنکر کی بات سن کر منوہر لال حیرت سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ یہ ہمدردی ہے یا دشمنی۔ کیا ہوگا اس ملک کا جہاں کے عوام کی سوچ اتنی پست ہو۔

ہمدردی یا دشمنی

بات بات پر قہقہے لگانے والے منوہر لال کو سر جھکائے بنچ پر خاموش بیٹھے دیکھ کر رام شنکر کو تعجب ہوا اور جب نمستے کا جواب بھی نہ ملا تو رام شنکر نے فکر مندی کے انداز میں منوہر لال سے پوچھا ''کیا بات ہے! بتاؤ کیا پریشانی ہے؟ اپنوں سے کیا چھپانا؟ ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے کام آسکوں۔''

منوہر لال اور رام شنکر ایک ہی دفتر میں چپراسی تھے۔ رام شنکر کے ہمدردی بھرے کلمات نے منوہر لال کی آنکھوں میں نمی لادی مگر وہ خاموش ہی رہا۔

''ارے یار کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جو تم اتنے پریشان ہو؟ آخر یار دوست ساتھی ہوتے کس لئے ہیں۔ بتاؤ کیا پریشانی ہے؟ آخر ہم کس دن کام آئیں گے؟'' رام شنکر نے منوہر لال کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

منوہر لال کچھ دیر تک رام شنکر کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ بات یہ ہے کہ میں نے اپنی بٹیا کی شادی دو سال قبل طے کر لی تھی۔ سوچا تھا تھوڑا تھوڑا انتظام کر کے شادی کر دوں گا۔ اپنے فنڈ سے قرض بھی لے لیا تھا مگر اس بیچ گھر والی کی بیماری نے اپنا رنگ دکھایا اور علاج پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوگئی۔ دو سال تک لڑکے والے خاموش رہے مگر

اب وہ اور انتظار کو تیار نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کس سے قرض مانگوں؟ پانچ ہزار روپئے کی بات ہے لڑکے والے بڑی مشکل سے دو مہینہ کی مہلت پر تیار ہوئے ہیں۔ مگر دو مہینے میں ہوگا کیا؟ اسی سوچ میں راتوں کی نیند غائب ہے اور ذہن پریشان ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

اچھا! تو یہ ہے معاملہ، جس کی وجہ سے تم پریشان ہو۔ یار یہ بھی کوئی پریشانی میں پریشانی ہے۔ پانچ ہزار روپیوں کا ہی تو معاملہ ہے ہو جائے گا انتظام۔ تم فکر نہ کرو۔ رام شنکر نے اس طرح کہا جیسے اس کی جیب میں پانچ ہزار روپے فالتو پڑے ہوں اور وہ ابھی نکال کر منوہر لال کو دے دے گا۔

بھیا تم تو اس طرح کہہ رہے ہو کہ جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ روپیوں کا انتظام ہوگا کہاں سے؟ منوہر لال نے سوال کیا۔

''روپیوں کا انتظام بہت آسان بات ہے۔ چلو چل کر چائے پیتے ہیں اور وہیں روپیوں کے انتظام کا راستہ بھی بتاتے ہیں۔'' رام شنکر نے کہا۔

منوہر لال خاموشی کے ساتھ رام شنکر کے ساتھ چل دیا۔ چائے کی دوکان پر رام شنکر نے دو چائے لیں اور کونے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے رام شنکر نے کہا۔ ''سنو! ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری گھر والی کے نام سے حکومت کی تعلیم یافتہ بے روزگار اسکیم کے تحت دس ہزار کی رقم قرض لے لیتے ہیں بس تمہارا کام چل جائے گا۔''

''کوئی بینک اتنی آسانی سے قرض کیسے دے گا؟'' منوہر لال نے سوال کیا

''قرض تو چٹکی بجاتے ملے گا۔ بینک منیجر کو اپنے دو ہزار روپئے کمیشن سے مطلب باقی سب ٹھیک۔'' رام شنکر نے کہا۔

''لیکن بینک منیجر کو دینے کے لئے دو ہزار روپیہ کہاں سے آئے گا؟'' منوہر لال نے مایوس ہو کر کہا۔

''رقم پہلے نہیں دینا ہے جو دس ہزار ملیں گے اسی میں سے دے دی جائے گی۔'' رام شنکر نے کہا۔

''چلو سب مان لیا مگر ضمانت کون لے گا کیونکہ اپنے پاس تو کوئی انتظام ضمانت کا نہیں ہے۔'' منوہر لال نے کہا۔

تم اس کی فکر نہ کرو ضمانت تو میں لے لوں گا۔ مگر اس کا خرچ ایک ہزار ہوگا لیکن گھبراؤ نہیں یہ بھی پہلے نہیں دینا ہے۔'' رام شنکر نے لاپرواہی سے کہا۔ رہا معاملہ سامان کی خریداری کی رسیدوں کا۔ اپنا ایک جان پہچان کا دوکاندار ہے اس سے دو ہزار میں دس ہزار کی رسیدیں حاصل ہو جائیں گی۔ بس سارا کام پکا۔ سب خرچ نکال کر تمہارے پاس پانچ ہزار روپے بچ جائیں گے۔ جس کی تم کو ضرورت ہے آیا کچھ سمجھ میں۔

ہاں! مگر سوال یہ ہے کہ قرض واپس کیسے ہوگا۔ دس ہزار کے بدلے ہاتھ آئیں گے پانچ ہزار مگر واپسی ہوگی دس ہزار کی۔ اصل کے ساتھ سود الگ سے۔ کہاں سے...... منوہر لال کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی رام شنکر بول اٹھا۔ تم بالکل جاہل ہو، حکومت کی رقم ہے واپسی کا کیا سوچنا سب چلتا ہے اس وقت کام چلاؤ بعد کیا ہوگا دیکھا جائے گا۔

رام شنکر کی بات سن کر منوہر لال حیرت سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا گویا کہہ رہا ہو کہ یہ ہمدردی ہے یا دشمنی۔ کیا ہوگا اس ملک کا جہاں کے عوام کی سوچ اتنی پست ہو۔

یہ کیسا سماج؟

نہیں دیدی! بات یہ نہیں ہے جس دن سے شکایت کر کے لوٹی ہوں اُس کے بعد سے اب لڑکے کا باپ اپنی بالکونی سے دوربین سے مجھے تاکتا رہتا ہے۔ میں پریشان ہوں کہ اب اس بڈھے کی شکایت کس سے کروں؟

یہ کیسا سماج ؟

آج بھی معمول کی طرح کالج کے اسٹاف روم میں ناشتہ کے وقفہ میں تمام استانیاں اکٹھا تھیں ۔گرم گرم چائے کی چسکی کے ساتھ ایک طرف سیاست پر گرم بحث چل رہی تھی تو دوسری طرف آپس میں ہنسی مذاق چل رہا تھا۔قہقہے گونج رہے تھے مگر مس شانتی بالکل خاموش تھیں چائے بھی ٹھنڈی ہورہی تھی یہ دیکھ کر میں نے آواز دی!''کس کی یاد میں کھوئی ہو شانتی ؟''

آں...... ہاں...... کیا...... نہیں...... تو...... کہتی ہوئی مس شانتی نے فوراً خود کو سنبھالا اور چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی مگر اس بیچ اس کی بڑبڑاہٹ کا سب نے لطف لیا اور ہنسی کے فوارے ابل پڑے۔

میرا اور مس شانتی کا گھر ایک ہی محلے میں ہونے کی وجہ سے اکثر ہم دونوں ایک ساتھ ہی کالج سے لوٹتے ۔آج بھی میں نے کالج کے بعد شانتی کو اپنے ساتھ لیا اور گھر کے لئے چل پڑی ۔راستہ میں میں نے مس شانتی سے پوچھا۔'' کیا بات ہے شانتی کہاں کھوئی سی ہو۔''

کوئی خاص بات نہیں ہے، سنتوش دیدی کچھ تھکان محسوس ہورہی ہے۔''شانتی نے

جواب دیا مگر میں اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکی۔ میں نے پھر کریدا اور سوال کیا۔ ''تھکان! ارے روز کے کام میں تھکاوٹ کیسی؟ کیا کوئی خاص کام کر ڈالا؟''

میرے اس انداز سے سوال کرنے پر شانتی کو ہنسی آ گئی۔ اس بات چیت میں راستہ کب ختم ہوا احساس ہی نہ ہوا۔ گھر کے پاس پہنچ کر مس شانتی نے مجھ سے کہا۔ ''آیئے دیدی! اب چائے پی کر ہی جایئے گا۔''

''کیوں نہیں! چائے پینے میں مجھے کیا پریشانی؟ مگر سوچتی ہوں کہ تم پہلے سے تھکی ہو۔ میں تمہاری تھکاوٹ بڑھانا نہیں چاہتی؟'' میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''ارے مذاق'' چھوڑو دیدی۔ آؤ نا۔ باقی باتیں چائے پر ہوں گی۔'' مس شانتی نے کہا۔

شانتی گھر میں اکیلے رہتی تھی، مجھے کمرے میں بٹھا کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ چائے اور بسکٹ لے کر وہ کمرے میں آئی اور میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے چائے پیجئے''۔

میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''چائے تو ٹھیک ہے مگر تم آج اداس کیوں ہو؟ اب تک جو تم نے بتایا وہ میرے گلے سے اتر نہیں رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے نہ بتانے والی ہو اس لئے نہ بتا رہی ہو۔ ویسے غم شیئر کرنے سے غم ہلکا ہی ہوتا ہے۔''

شانتی نے میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا۔ اس وقت میں بہت نروس ہوں۔ بات بہت چھوٹی ہے آپ جانتی ہو کہ میں بہت محتاط رہتی ہوں۔ کسی سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتی۔ اس لئے عام طور پر بہت کم لوگوں سے جان پہچان ہے۔ وہ سامنے جو مکان ہے اس میں ایک لڑکا جو مجھ سے آدھی عمر یعنی ۱۳۔۱۴ سال کا ہوگا، رہتا

ہے۔آج سے دو مہینہ پہلے کی بات ہے میں گلابی ساڑی پہنے کالج کے لئے نکلی۔ چند قدم بعد ایک لڑکا میرے قریب آیا اور بولا میں آپ کے گھر کے سامنے والے مکان میں رہتا ہوں۔ میں روز آپ کو دیکھتا ہوں آپ بہت اچھی لگتی ہیں پنک کلر میں آپ بہت جم رہی ہیں۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کی بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ بلکہ یہ سوچ کر کہ بچہ ہے اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے کہا تم بھی تو اسمارٹ بوائے ہو تم بھی اچھے لگتے ہو۔ کچھ دنوں بعد ایک دن پھر وہ اسی جگہ پر ملا میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولا۔ آپ گلابی رنگ ہی پہنا کریں اس رنگ میں آپ خوبصورت لگتی ہیں۔ میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آئی لو یو۔

میں نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا اچھا! ٹھیک ہے کرتے رہو پیار۔

''نہیں ...... میں ...... لیلیٰ مجنوں والا پیار نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو آپ سے اس طرح لَو کرنا چاہتا ہوں جیسے ہیرو، ہیروئن فلم میں کرتے ہیں کبھی میرے ساتھ کسی پارک، ہوٹل یا پکچر ہال چلئے تو مزہ آئے''۔ اس کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ یہ عمر اور یہ حوصلے مگر سڑک کا معاملہ تھا میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چلتی چلی گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن ...... آج تو اس نے حد ختم کر دی۔ صبح جب میں کالج کے لئے تیار ہو رہی تھی کال بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہی لڑکا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ اندر آیا اور بولا۔ ''آج ویلنٹائن ڈے ہے یعنی یوم محبت اور ایک گلاب کا پھول میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ چلئے آج کسی پارک یا ہوٹل میں 'لو ڈے' انجوائے کیا جائے''۔

یہ سنتے ہی میرے غصہ کا پارہ انتہا پر پہنچ گیا میں نے اسے بری طرح پھٹکارتے ہوئے کہا ''شرم نہیں آتی اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔ گیٹ آؤٹ۔ آئندہ ادھر کا

رخ نہ کرنا''۔

شانتی کو اس وقت بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اسے نارمل کرنے کے لئے مزاحاً کہا۔

''شکر کرو اوپر والے کا کہ اس عمر میں بھی تم سے آدھی عمر کے لوگ تم پر مر رہے ہیں۔ یہاں تو اپنی عمر سے بڑا بھی میرے ساتھ جینے کو تیار نہیں۔''

''نہیں دیدی! یہ بات نہیں ہے میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ وہ جس وقت آیا تھا اگر اس وقت گھر میں مُہری ہوتی اور اسے یہ بات معلوم ہوتی تو پھر پورے محلے میں میرے چرچے ہو رہے ہوتے۔ اسی بات نے مجھے نروس کر دیا۔''

''پگلی کہیں کی۔'' میں نے کہا۔ اٹھو ابھی میں تمہارے ساتھ چل کر اس کے والدین سے بات کرتی ہوں۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو پھر سوچا جائے گا۔

میں شانتی کے ساتھ اس کے مکان پر گئی۔ دستک دینے پر ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا اور پوچھا کس سے ملنا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ سے ملنا ہے۔ انہوں نے اندر بلایا۔ چھوٹے سے کمرے میں تخت پر ہم دونوں کو بٹھانے کے بعد انہوں نے آنے کا مقصد جاننا چاہا۔ میں نے پوری بات بتائی اور کہا صاحب زادے کو سمجھا دیجئے ورنہ معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ اسی وقت بغل کے کمرے سے لڑکے کے والد برآمد ہوئے اور بولے آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کی ٹھیک سے خبر لوں گا۔ آئندہ آپ کو شکایت نہ ہوگی۔ میں شانتی کو دلاسا دے کر اسے گھر چھوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔

کئی ہفتے گذر گئے۔ ایک دن کالج سے واپسی میں مجھے اس لڑکے کا خیال آیا۔ میں نے شانتی سے پوچھا۔ ''کہو تمہارے اس فلمی عاشق کا کیا حال ہے۔''

میری بات سن کر شانتی نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں افسوس کے ساتھ کہا۔ ''وہ فلمی

عاشق تو درست ہو گیا مگر......''

مگراب کیا؟ کیا اب تم کو اس سے واقعی محبت ہو گئی ہے۔''

نہیں دیدی! بات یہ نہیں ہے جس دن سے شکایت کر کے لوٹی ہوں اس کے بعد سے اب لڑکے کا باپ اپنی بالکونی سے دوربین سے مجھے تاکتا رہتا ہے میں پریشان ہوں کہ اب اس بڈھے کی شکایت کس سے کروں۔''

چھوڑو بھی ......سماج اتنا بگر چکا ہے کہ اسے ہم اکیلے نہیں بدل سکتے تعلیم لاکھ ہو جب تک گھر کی تربیت نہ ہوگی سدھار نہ ہوگا۔''

☆☆☆

خون کا ٹھیکیدار

اس بل کو دیکھ کر مجھے خون کا ٹھیکیدار فرشتہ معلوم ہونے لگا اور نرسنگ ہوم والے خون چوسنے والے درندے۔ مرتا کیا نہ کرتا بل چکایا اور یہ کہتے ہوئے نرسنگ ہوم سے واپس ہوئے۔ خدا بچائے ان نرسنگ ہوم والوں سے۔

خون کا ٹھیکیدار

موت، محبت اور مصیبت روپی میزائل کب کسی ذی روح پر گر کر اس کی حیات کو ریزہ ریزہ کر دے کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا تلخ تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ میں اپنی بیگم کے ساتھ ایک ٹور گروپ کے ساتھ آگرہ کے سفر پر تھا۔ پورا قافلہ بس سے سفر کر رہا تھا۔ ٹور پروگرام اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ راستے میں جو تاریخی مقامات ملیں ان کی سیر کرتے ہوئے آخری پڑاؤ آگرہ ہو جہاں تاج محل دیکھا جائے۔

بس کا تکلیف دہ سفر تو آپس کی بات چیت، ہنسی مذاق کے درمیان آسانی سے کٹ رہا تھا۔ لیکن واہ ری قسمت آگرے سے کچھ کلومیٹر پہلے بیگم کے پیٹ میں درد اٹھا۔ اس درد نے چند منٹوں میں اس قدر شدت اختیار کر لی کہ سبھی لوگ پریشان ہو اٹھے۔ میرے تو اوسان ہی خطا ہونے لگے۔ مشورہ سے یہ طے پایا کہ جو بھی آبادی نظر آئے وہاں رک کر علاج کرایا جائے۔

مالک حقیقی کے کرم سے بہت جلد ایک آبادی نظر آئی۔ فوراً وہاں پر لوگوں سے معلومات کی گئی۔ جس سے یہ علم ہوا کہ قلبِ آبادی میں ایک نرسنگ ہوم ہے۔ بیگم کو لے کر میں نرسنگ ہوم پہنچا۔، ڈاکٹر نے فوراً مریضہ کو چیک اپ کے لئے لٹایا مگر دوسری طرف علاج

کے لئے ایڈوانس رقم جمع کرنے کا مطالبہ ہوا۔ایڈوانس رقم جمع ہونے کے بعد ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا انجکشن لگائے اور گلوکوز چڑھانا شروع کیا۔اس عمل سے مریضہ کے درد کی شدت میں کمی آگئی اور سکون ہونے لگا۔میں نے بھی سکون کی سانس لی۔

کچھ گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کے لئے کہا۔میں نے ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق الٹرا ساؤنڈ کرایا۔رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر نے بتایا کہ مریضہ کی آنت میں خرابی ہے جس کے لئے فوری آپریشن ضروری ہے۔یہ سن کر میں پریشان ہوگیا۔میری پریشانی یہ نہ تھی کہ رقم کا مسئلہ ہو بلکہ میں اکیلا تھا سبھی ساتھی جا چکے تھے اور جگہ بھی بالکل اجنبی تھی لیکن ڈاکٹر کا اس بات پر زور تھا کہ آپریشن ضروری ہے ورنہ مرض بگڑ سکتا ہے جو مریضہ کی زندگی کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔مجبوراً میں نے آپریشن کے لئے منظوری دے دی۔میں نے فوری طور پر بیگم کے والد کو بذریعہ ٹیلی فون اس کی اطلاع دی۔پوری رات میں نے بیگم کے بیڈ کے پاس بیٹھ کر گذار دی۔صبح جب ڈاکٹر آئے تو انہوں نے دوا کی ایک فہرست مجھے دیتے ہوئے کہا یہ دوائیں بازار سے لے آئیں اور ہاں مریضہ کافی کمزور ہے لہٰذا آپریشن سے پہلے خون کی ضرورت بھی پڑے گی۔میں ابھی بلڈ ٹیسٹ کروا کر آپ کو بلڈ گروپ بتاتا ہوں۔بیگم کا بلڈ گروپ ''بی نگیٹیو'' نکلا۔مجھے اس سلسلہ میں کوئی خاص معلومات نہیں تھی اس لئے میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ میرے خون کی بھی جانچ کرلیں۔اگر گروپ مل جائے تو اپنا خون دے دوں۔مگر میرا بلڈ گروپ ''اے پازیٹیو'' نکلا۔اس لئے خون بھی بازار ہی سے لینا تھا۔دوائیں تو آسانی سے مل گئیں مگر وہاں کے بلڈ بینک میں مطلوبہ گروپ کا خون نہیں مل سکا۔میں نے لوٹ کر ڈاکٹر کو اپنی پریشانی بتائی تو انہوں نے انتہائی ترش لہجہ میں کہا۔خون کے بغیر آپریشن کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اور یہ رسک ہم نہیں لے سکتے آپ کہیں سے بھی انتظام کریں۔

میرے سامنے اب یہ نئی مصیبت آپڑی تھی۔میں نے بیگم کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور یہ سوچ کر باہر نکلنے لگا کہ پھر کوشش کی جائے۔اسی وقت ایک وارڈ بوائے میرے پاس آیا اور

مجھے الگ بلا کر کہنے لگا آپ خون کے لئے اس ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کیجئے ہو سکتا ہے کہ آپ کا کام بن جائے۔ کیونکہ اس خون کے ٹھیکیدار کے پاس ہر گروپ کے بلڈ سیلر ہیں یہ کہہ کر وہ نمبر لکھوا ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک آدمی پر پڑی اور وہ بولا لیجئے یہ تو یہیں موجود ہے آپ بات کر لیجئے۔ میں اس خون کے ٹھیکدار سے ملا۔ اس سے اپنی پریشانی بتائی۔ میری بات سن کر وہ تاجرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ارے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ابھی دس منٹ میں آپ کو اس گروپ کا بلڈ سیلر مہیا کراتا ہوں مگر ایک بوتل خون کی قیمت سات سو(۷۰۰) روپئے ہوگی کیونکہ یہ بلڈ گروپ بہت کم ملتا ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ ٹھیک ہے تم انتظام کرو۔ میری بات سن کر اس نے ٹیلی فون پر کسی سے بات کی اور آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ایک آدمی حاضر تھا۔ ٹھیکیدار نے اسے دس روپیہ کا نوٹ دیتے ہوئے کہا جاؤ جوس پی کر آؤ۔ نوٹ لے کر وہ شخص چلا گیا اس کے جانے کے بعد ٹھیکیدار نے کہا۔ یہ بلڈ سیلر ہے اس کی اطلاع پر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ آنے والا شخص بالکل مریل قسم کا تھا اور آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اس کا خون قابلِ استعمال ہوگا یا نہیں؟ میری پریشانی کو سمجھتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا آپ بے فکر رہیں یہ تصدیق شدہ بلڈ سیلر ہے اس کے خون میں کسی قسم کی خرابی نہ ہوگی۔ معاملہ بزنس کا ہے اگر میں پوری قیمت لے کر خراب مال سپلائی کروں گا تو میرا بزنس کیسے چلے گا۔ اسی درمیان وہ شخص آ گیا۔ میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ڈاکٹر نے اس کا خون لیا۔ مگر یہ کہا ایک بوتل خون کا اور انتظام کر لیجئے شاید ضرورت پڑ جائے۔ یہ سن کر مجھے فکر ہوئی کہ اب کیا کریں۔ ڈاکٹر کے پاس سے لوٹ کر میں خون کے ٹھیکیدار کے پاس آیا اور اس کو رقم دیتے ہوئے ایک بوتل اور خون کے لئے کہا۔ میری بات سن کر اس نے اسی پرانی تاجرانہ مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ فکر کی کوئی بات نہیں کام تو چل رہا ہے دوسری بوتل خون بھی مل جائے گا مگر کچھ وقت لگے گا۔ کیونکہ دوسرا بلڈ سیلر دور رہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا دوسری بوتل، خون کی ضرورت پڑنے پر لوں گا ورنہ نہیں۔ میری اس بات پر اس نے کہا۔ خون نہ لینے پر آپ کو خرچ کے

سو روپے دینے ہوں گے۔ میں نے اس کی اس بات کو منظور کر لیا۔ اس نے پھر ٹیلی فون سے بلڈ سیلر سے رابطہ قائم کیا اور لوٹ کر میرے پاس آ گیا۔ اس بیچ ڈاکٹروں نے آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ میں آپریشن روم کے باہر اضطرابی کیفیت میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت ٹھیکیدار نے مجھے بہت سہارا دیا۔ وہ میرے ساتھ اسی جگہ بیٹھ گیا اور اس طرح بات کرنے لگا کہ میں اس کی باتوں میں محو ہو کر رہ گیا۔ ہم لوگ بات کر ہی رہے تھے کہ دوسرا بلڈ سیلر آ گیا یہ بھی پہلے والے کی طرح ہی تھا اسے دیکھ کر میں سوال کیا کہ آخر ان لوگوں کے جسم میں اتنا خون کس طرح تیار ہو جاتا ہے کہ یہ بیچ دیتے ہیں۔ میر بات سن کر اس نے تفصیل سے بتایا کہ ایک بار خون دینے کے بعد اتنا خون دوبارہ بننے میں کوئی خاص وقت نہیں لگتا مگر خون میں جو ضروری اجزاء ہوتے ہیں وہ اتنی جلدی نہیں بن پاتے۔ اس لئے اگر جلد ضرورت پڑتی ہے تو ہم ان سیلروں کو ان اجزاء کے جلد تیار ہونے کے لئے دوائیں استعمال کراتے ہیں۔ مثال کے طور پر آئرن کے لئے آئرن کی گولی وغیرہ اس بزنس میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ سارے خرچ نکال کر چالیس سے پچاس روپے ایک بوتل پر بچتا ہے ہاں مگر کمیاب گروپ کے خون پر ایک سو سے لے کر ڈیڑھ سو روپے بوتل تک بچت ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات بتا رہا تھا لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھی اور تاجروں کی طرح اپنا نفع کم کر کے بتا رہا ہوگا۔ وقت گذرتا گیا۔ آپریشن کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مجھے اور خون کی ضرورت نہ پڑی میں نے حسب وعدہ ٹھیکیدار کو سو روپیہ دیتے ہوئے بلڈ سیلر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔ آپریشن روم سے بیگم کو بیڈ پر پہنچایا دیا گیا تھا۔ میں بیڈ کے پاس ہی بیٹھ گیا ابھی بیگم کو ہوش نہیں آیا تھا۔ شام کو میرے خسر اور ہم زلف بھی پہنچ گئے۔ ہم سب بے چینی کے عالم میں تھے رات گئے بیگم کو ہوش آیا تو ہم لوگوں کے چہرے بھی کھل اٹھے۔

پانچ دن نرسنگ ہوم میں رہنے کے بعد جب پروانہ رخصتی ملا تو اس کے ساتھ ۲۲ ہزار چھ سو کتیس روپے کا بل لگا تھا۔ بل دیکھ کر میں چکرا گیا کیونکہ ساری دوائیاں الٹراساؤنڈ اور بلڈ سب کی قیمت تو میں پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ یہ بل صرف آپریشن کی فیس اور پانچ دن

نرسنگ ہوم میں رہنے کا تھا۔ اس بل کو دیکھ کر مجھے خون کا ٹھیکیدار فرشتہ معلوم ہونے لگا اور نرسنگ ہوم والے خون چوسنے والے درندے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بل چکایا اور یہ کہتے ہوئے نرسنگ ہوم سے واپس ہوئے۔ خدا بچائے ان نرسنگ ہوم والوں سے۔

☆☆☆

زمین کی شاعری

اسی طرح جب دو مصرعوں کو موزوں کر لینے والے یہ شاعر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ بہت بڑے دانشور ہوں۔ اپنے آگے کسی کو عقل مند گردانتے ہی نہیں۔ ایک خاص صفت ان کی یہ ہے کہ یہ عام آدمی تو کجا کسی دوسرے شاعر کو بھی اپنے سے بہتر ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔

زمین کی شاعری

شاعروں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے ان کا طرزِ زندگی بھی عجب ہے، ان کا ایک انوکھا نقطۂ نظر ہے اور اسی نقطۂ سے یہ پوری دنیا کو دیکھتے ہیں۔ حقیقی دنیا اور اس کے مسائل سے دور صرف خیالی دنیا میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جب ان پر شعروں کا نزول ہوتا ہے تو یہ اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ انہیں کسی بات کی فکر نہیں رہتی۔ راستہ میں بھی مست چلے جارہے ہیں۔ اس بات کا احساس ہی نہیں کہ کہاں جانا ہے یعنی جانا کہاں تھا پہنچ گئے کہاں۔ رستے میں کوئی اور چل رہا ہے یا نہیں کوئی گاڑی چل رہی ہے یا نہیں کسی بات کی پرواہ نہیں اگر اسی بے خیالی میں کسی سے ٹکرا گئے تو چونک اٹھے مگر پھر اپنی دھن میں مست۔ اسی طرح یہ مخلوق فکرِ معاش سے آزاد ہونے کے ساتھ حقوق العباد سے بھی آزاد رہتی ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو کامیاب مانتے ہیں اور مانے بھی کیوں نہ؟ کیونکہ جب یہ اپنی تخلیق کردہ تصوراتی شعری کاوش کو لکھ کر سناتے ہیں اور سامعین ان پر داد، بے داد کے ڈونگرے برساتے ہیں تو یہ اس طرح پھولتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی عظیم کارنامہ انجام دیا ہو۔ اسی طرح جب دو مصرعوں کو موزوں کر لینے والے یہ شاعر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ بہت بڑے دانشور ہوں۔ اپنے آگے کسی کو عقل مند گردانتے ہی

نہیں۔ایک خاص صفت ان کی یہ ہے کہ یہ عام آدمی تو کجا کسی دوسرے شاعر کو بھی اپنے سے بہتر ماننے کو تیار نہیں ہوتے ہر شاعر اپنے کو ہی استادِ زمانہ ثابت کرتا رہتا ہے۔

لیکن ...... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بالکل سیدھا سادہ انجان آدمی اپنی باتوں سے ان کو ایسا لاجواب کر دیتا ہے کہ یہ تلملا کر رہ جاتے ہیں۔ساری شاعری اور چرب زبانی ناکام ہو جاتی ہے۔اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ایک شاعر جو اپنے کلام اور ترنم کی وجہ سے اسٹیج کا کامیاب ترین ہیرو تھا،ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گاؤں گیا گاؤں کا پرسکون ماحول ،دلفریب مناظر اور اس پر غیر شاعر دوست کی ضیافت نے اسے ساری فکروں سے آزاد کر دیا۔چند دن تو آرام سے گذرے۔اس کے بعد اس کے اندر کا شاعر جاگ اٹھا اور وہ بے چین ہونے لگا۔اسے یہاں اپنی شعری تخلیقات سنانے اور داد و تحسین حاصل کرنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ اپنی تخلیقات کسے سنائے؟ کوئی سننے والا تو ملے۔ایک دن صبح وہ اپنے دست کے گھر کے باہر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اتفاقاً برابر والے گھر سے ایک کسان اپنے بیلوں کے ساتھ نکلا۔شاعر نے موقع غنیمت جانا اور آواز دی۔''ارے بھائی ذرا سنیے گا۔''

کسان نے غور سے دیکھا اور اس کے قریب آ گیا۔

شاعر نے کہا ''بیٹھو میں تم کو ایک نظم سناتا ہوں۔''

''نظم! یہ کیا ہوتی ہے؟'' کسان نے پوچھا۔

''ارے شاعری'' شاعر نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا۔''تم نے شاعری کا نام تک نہیں سنا؟ یہ وہی شاعری ہے جس میں گلاب مہکتے ہیں۔چندن کی خوشبو ماحول کو تروتازہ کر دیتی ہے۔چاندنی گاتی ہے تصورات کی دنیا میں پریاں رقص کرتی ہیں نئے نئے جہاں آباد ہوتے ہیں اور جانتے ہو کہ اس میں وہ حسین باغ ملتے ہیں جس کی بہاریں خزاں

سے دوچار نہیں ہوتیں اور ایسے کھیت ہوتے ہیں جن کی فصلوں پر کبھی پالے کا اثر نہیں ہوتا۔'' شاعر اپنی ترنگ میں دانشورانہ انداز میں کسان سے خطاب کر رہا تھا اور کسان حیرت سے تک رہا تھا۔ شاعر نے بات ختم کر حسرت بھری نگاہوں سے کسان کی طرف دیکھا تو کسان کو حیرت زدہ پایا۔ شاعر نے اپنے لہجہ میں مٹھاس گھول کر سوال کیا۔ ''کچھ سمجھے؟''

کسان نے تحیر کے دریا میں غوطے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس سے پیٹ بھی بھرتا ہے؟''

''ارے پیٹ کیسے بھرے گا'' شاعر نے اپنے ہونٹ سکوڑ کر اور پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ ''یہ تو تصورات کی دنیا ہے۔''

شاعر کی بات سن کر کسان مسکرایا اور بیلوں کی نکیل کو جنبش دے کر آگے بڑھا۔

''ارے نظم تو سنتے جاؤ۔'' شاعر نے آواز دی مگر کسان نہ رکا تو شاعر نے چلا کر کہا۔ ''کہاں جا رہے ہو میری بات تو سنتے جاؤ؟''

کسان نے پلٹ کر دیکھا اور جواب دیا۔ حقیقت کی دنیا میں زمین کی شاعری کرنے جس سے میرا ہی نہیں دوسروں کا بھی پیٹ بھرے گا۔''

کسان کا جواب سن کر شاعر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

سیاست ترے کھیل نرالے

مگر کیا؟............ ارے یہ ساری سیاسی پارٹیاں ایسے لوگوں کو پالتی ہیں اور ہمت افزائی کرتی ہیں تا کہ وقت ضرورت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ان کا استعمال کر سکیں۔ یہ سیاسی رہنما بھی اس سلسلے میں دوہرا معیار رکھتے ہیں۔

سیاست ترے کھیل نرالے

''سیاست میں جرائم پیشہ افراد کی بڑھتی شمولیت اور مجرمانہ کردار رکھنے والے سفید پوش افراد کی بڑھتی تعداد پر عوام کا جو بھی ردِ عمل ہو سیاسی پارٹیوں کا نقطۂ نظر صاف نہیں۔ عام طور پر سیاسی پارٹیوں کے بڑے لیڈران عوامی ردِ عمل کے پیشِ نظر صرف تقریر تک اس بات کے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں کہ سیاست کو جرائم پیشہ عناصر سے پاک رکھا جائے۔ ہماری پارٹی نے ایسے افراد کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی اور آئندہ بھی ایسے لوگوں کو پارٹی کا ٹکٹ نہیں دیا جائے گا۔ ہم نے پارٹی میں انہیں لوگوں کو جگہ دی ہے جن کی امیج عوام میں صاف ستھری ہے۔ ایک نجی محفل میں شغلِ مے نوشی کے دوران ایک آئی۔ پی۔ ایس افسر نے اپنے میزبان سے دورانِ گفتگو جب یہ بات کہی، تو میزبان نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بات تو سچ ہے مگر۔''

''مگر کیا؟...... ارے یہ ساری سیاسی پارٹیاں ایسے لوگوں کو پالتی ہیں اور ہمت افزائی کرتی ہیں تاکہ وقت ضرورت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ان کا استعمال کرسکیں۔ یہ سیاسی رہنما بھی اس سلسلے میں دہرا معیار رکھتے ہیں۔ جب تک کوئی مافیا ان کی پارٹی میں ہے اس کے سارے عیب ہنر نظر آتے ہیں اور اگر مخالف جماعت کا ہے تو تل کا

تاڑ بنا کر اسے بین الاقوامی مافیا ثابت کر دینا کوئی بات ہی نہیں۔ اگر اپوزیشن کا کوئی ایسا شخص پارٹی بدل کر حکمراں پارٹی میں آجائے تو پھر وہ ''مافیا'' سے ''محترم'' ہو جاتا ہے ان حالات میں سب سے زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم جیسے پولیس اور انتظامیہ کے افسران کو۔'' یہ کہتے ہوئے آئی۔ پی۔ ایس افسر کی آواز اب زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ دوسرے لوگوں نے اس طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

میزبان نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ارے یار چھوڑو ان سب باتوں کو اس وقت تو پارٹی کا مزہ لو۔''

''کیا مزہ لوں پارٹی کا؟ ابھی تک میری نظروں میں وہ منظر گھوم رہا ہے کس طرح وہ مسکرا رہا تھا۔'' آئی۔ پی۔ ایس افسر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ارے کون؟'' میزبان نے پوچھا۔

''کون؟'' ''سنو! آئی۔ پی۔ ایس افسر نے کہنا شروع کیا۔ پرسوں رات محکمۂ پولیس کے سربراہ نے ایک لمبی میٹنگ کے بعد یہ احکام دیے کہ میں مسٹر شوبھا رام کو ان کے مجرمانہ کردار کے لئے صبح گرفتار کرنے کی کاروائی کروں۔ چونکہ مسٹر شوبھا رام اپوزیشن کے تیز طرار لیڈر اور مافیا سرغنہ ہیں اس لئے یہ بھی طے پایا کہ گرفتاری کے وقت فورس بھی ساتھ رہے تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ پروگرام کے مطابق صبح میں مسٹر شوبھا رام کے بنگلہ پر پورے فورس کے ساتھ پہنچا۔ ہر طرح سے مطمئن ہو کر میں نے کال بیل بجائی۔ دروازہ مسٹر شوبھا رام نے ہی کھولا۔ میں نے انہیں وارنٹ گرفتاری دکھایا۔ اور...... میں آگے کچھ کہتا مسٹر شوبھا رام نے بہت نرمی کے ساتھ مجھ سے کمرے میں آنے کو کہا۔ میں اپنے جونیر کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو مسٹر شوبھا رام نے کہا۔ ''کیا آپ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیں گے؟'

''شیور! آپ شوق سے فون کرلیں۔''میں نے بھی نرمی سے کہا۔

مسٹر شوبھا رام نے کسی کو فون ملایا اور کچھ دیر بات کرنے کے بعد فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''آپ بات کرلیں۔''

''ہلو!''میں نے کہا۔

دوسری طرف سے محکمۂ پولیس کے سربراہ نے کہا۔''سنو! تم واپس چلے آؤ گرفتاری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کل آپ نے ہی تو مجھ سے اس کارروائی کے لئے کہا تھا اور اب آپ ہی منع کررہے ہیں۔''میں نے کہا۔

''شاید تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔اب شوبھا رام اپوزیشن میں نہیں ہیں وہ اب حکمراں جماعت میں شامل ہو گئے ہیں اس طرح ان کا دَل ہی نہیں بدلا دِل بھی بدل گیا ہے۔اوراب وہ''مافیہ''نہیں''مانیہ''بن گئے ہیں۔''محکمۂ پولیس کے سربراہ نے کہا۔

میں نے فون رکھا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس چل دیا مسٹر شوبھا رام دروازے تک میرے ساتھ آئے اور اس طرح مسکرا کر رخصت کیا جیسے انہوں نے یہ فتح مجھ پر حاصل کی ہو۔میں لاچار و مجبور کی طرح گردن جھکائے چلا آیا۔

پوری کہانی سن کر میزبان کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔واہ ری سیاست تیرے کھیل نرالے۔

☆☆☆

نئی سوچ

وہ پاگل نہیں بلکہ آج ترقی یافتہ دور کا پڑھا لکھا جاہل ہے۔ ایسے لوگ ہر بات میں نئی سوچ پیدا کرنا، وقت اور پیسے کو برباد کرنا، اپنی شان سمجھتے ہیں۔

نئی سوچ

اتوار کا دن تھا۔حسب معمول میں آج مکمل آرام ک موڈ میں تھا۔صبح کے آٹھ بج رہے تھے مگر میں ابھی تک بستر پر ہی تھا۔اسی وقت والد صاحب کی آواز سنائی دی۔

''کیا بات ہے ابھی تک تیار نہیں ہوئے کیا حیدرگڑھ نہیں چلنا ہے؟ تم نے ہی تو وعدہ کیا تھا کیا بھول گئے؟''

والد صاحب کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ آج ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے حیدرگڑھ جانے کے واسطے میں نے والد صاحب سے وعدہ کیا تھا۔

''بس دو منٹ میں تیار ہوتا ہوں۔''میں نے والد صاحب کو جواب دیتے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔تھوڑی ہی دیر میں تیار ہو کر میں والد صاحب کے ساتھ بس اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا۔قیصر باغ بس اسٹیشن پر بس تیار تھی بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ رینگ رہی تھی ہم لوگ اس پر سوار ہو گئے۔کنڈکٹر سے ٹکٹ کے لئے کہا اور مطلوبہ رقم دے کر سیٹ پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر میں بس آئی۔ٹی۔کالج چوراہے پر پہنچی۔وہاں پر چند مسافروں کے ساتھ ایک نوجوان بھی بس میں داخل ہوا۔نوجوان نے بس میں داخل ہوتے ہی کنڈکٹر سے پوچھا۔

''بارہ بنکی کا کرایہ کیا ہے۔''

''۱۲/روپے'' کنڈکٹر نے جواب دیا۔

''۱۲/روپے۔وہ کیسے؟ ۱۲/روپئے تو بس اسٹیشن سے کرایہ ہے یہاں سے بارہ روپے کیسے؟'' نوجوان نے اپنی معلومات کا رعب ڈالتے ہوئے جرح کی۔

یہ کوئی بس اسٹینڈ نہیں ہے کرایہ تو بس اسٹیشن سے پڑے گا۔'' کنڈکٹر نے جواب دیا

''بس روکو میں نہیں جاتا۔جب کرایہ پورا دینا ہے تو بس اسٹیشن سے ہی کیوں نہ بیٹھ کر آؤں۔'' نوجوان ترش لہجے میں بولا۔

کنڈکٹر نے بس رکوادی۔نوجوان اتر کر چلا گیا۔جب بس پھر چلی تو لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔عجیب آدمی ہے یہاں سے بلا وجہ واپس بس اسٹیشن جائے گا۔وقت اور پیسہ دونوں برباد کرے گا۔کم از کم دس روپیہ تو رکشہ کا خرچ آئے گا اور ایک گھنٹہ کا وقت بھی زیادہ لگے گا۔یعنی ۲۲/روپیہ میں ایک گھنٹہ تاخیر سے اپنی منزل مقصود پر پہنچے گا۔

''یہ کوئی عقل مندی نہیں۔'' ایک مسافر نے کہا۔

''لگتا تو پڑھا لکھا تھا۔'' دوسرے مسافر نے بات بڑھائی۔

''پاگل ہوگا'' کسی مسافر نے چٹکی لی۔

نہیں! ایک بزرگ نے لقمہ دیا۔وہ پاگل نہیں بلکہ آج کے ترقی یافتہ دور کا پڑھا لکھا جاہل

ہے ایسے لوگ ہر بات میں نئی سوچ پیدا کرنا ، وقت اور پیسے کو برباد کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔اسی لئے اس وقت بھی وہ نوجوان اپنی عقل مندی اور جھوٹی شان دکھا کر چلا گیا۔

ان بزرگ کی بات سن کر میں سوچنے لگا کہ کیا وقت اور دولت کی بربادی کرنے والے ایسے لوگ کامیاب زندگی گذار سکتے ہیں۔دل نے جواب دیا۔نہیں۔کیونکہ جو وقت کی قدر نہیں کرتے وقت ان کی قدر نہیں کرتا۔

☆☆☆

Dast -e- Hinai

جناب منظور پروانہ کے جو افسانے زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں ان میں رومانیت ضرور ہے مگر اس کے باوجود وہ ''فراریت'' نہیں ہے جو رومانی ادیبوں اور شاعروں کے یہاں عموماً موجود رہتی ہے اور نہ ہی زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرا کر خواب وخیال کی ایک ایسی تصوّراتی دنیا میں بھاگ جانے کی خواہش نظر آتی ہے جو کہیں موجود نہ ہو۔ زیر نظر مجموعے میں شامل افسانوں کے پلاٹ ہماری زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے لئے گئے ہیں اور ان کی پیش کش ایک ایسی صاف ستھری زبان میں کی گئی ہے جو آسانی کے ساتھ قاری کو اپنے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ اس طرح کے افسانے ممکن ہے کہ ''جدیدیت'' اور ''مابعد جدیدیت'' کے قلم کاروں کے معیار نقد ونظر پر مکمل طور سے پورے نہ اتریں مگر ان کی بنیاد زندگی کے حقیقی واقعات اور ہمارے گرد وپیش بکھری ہوئی جو [illegible] ہیں ان پر رکھی گئی ہے......

زبان وبیان کے اعتبار سے دورِ حاضر کے افسانوں میں [illegible] معیار کی کمی پائی جاتی ہے۔ مگر منظور پروانہ کے افسانوں میں [illegible] انداز بیان ہے جس کی تعریف نہ کرنا ایک [illegible] نظر انداز [illegible] کے مرادف ہوگا۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

Manzoor Parwana

Designed & Printed At: Nomani Printing Press, Lucknow. Mobile: 9935114393